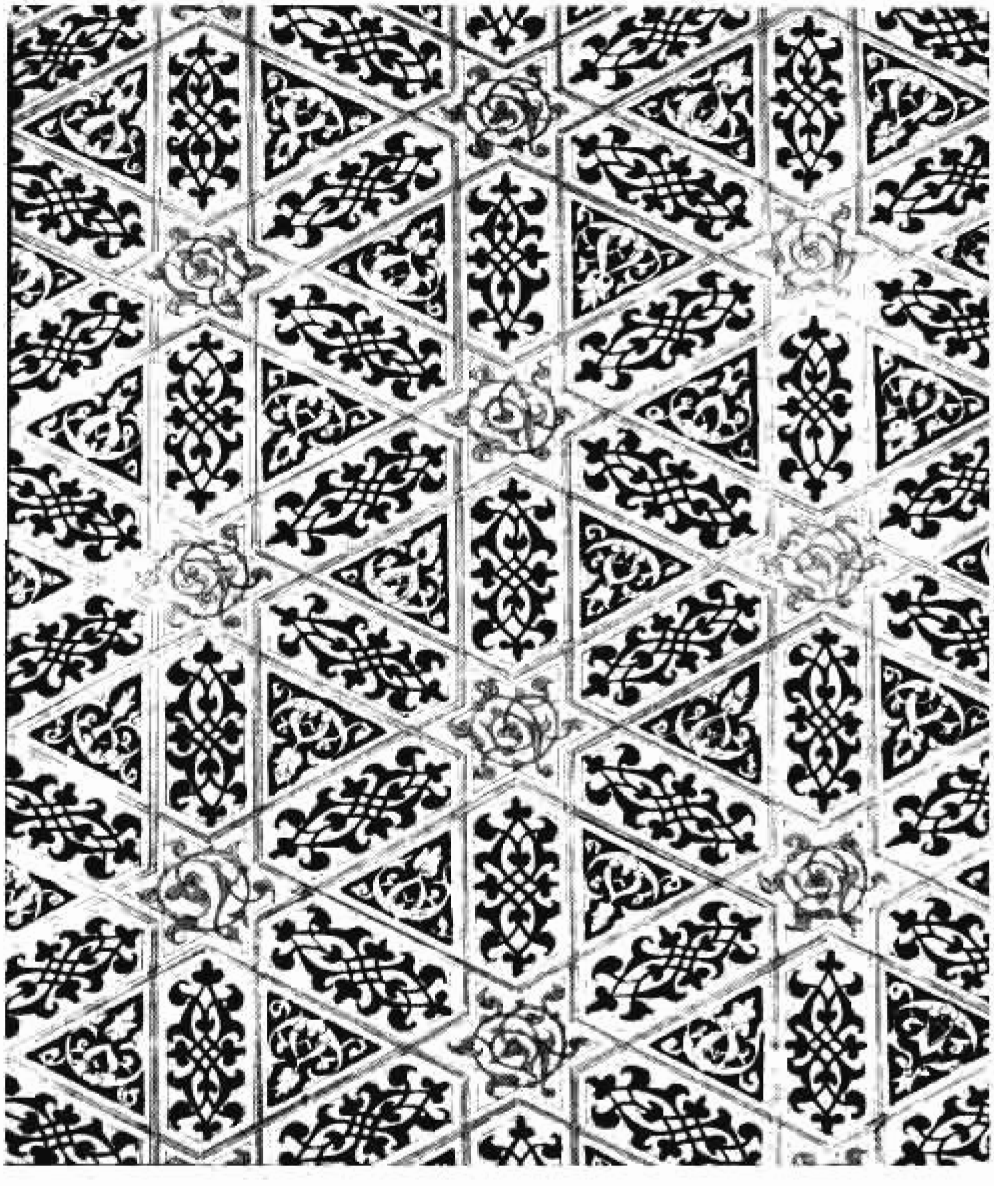
ماہنامہ

ترجمان القرآن

بانی
سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۹۹۸

مُدیر
خورشید احمد



ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد   نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد جلد ۱۲۵   جولائی ۱۹۹۸، ربیع الاول ۱۴۱۹   عدد ۷

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۳۲۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶۱ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

رسالہ "الجمعیت" سے ایک درخواست

[۱۹۳۸ میں' رسالہ] الجمعیت [دہلی] میں' جب مدیر ترجمان القرآن اور تحریک دارالاسلام پر مسلسل حملے شروع ہوئے تو مینیجر ترجمان القرآن نے دفتر الجمعیت سے درخواست کی کہ ذیل کا اشتہار اپنے اخبار میں اجرتاً شائع فرما دیں:

ناظرین الجمعیت کی انصاف پسندی سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھے بغیر کوئی رائے قائم کرنا پسند نہ کریں گے۔ لہٰذا جو حضرات دوسرا رخ دیکھنا چاہیں' وہ رسالہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش مفت اور ترجمان القرآن کے وہ پرچے جن کے مضامین پر نکتہ چینی کی گئی ہے' نصف قیمت پر طلب فرمالیں۔

اس کا جو جواب الجمعیت سے وصول ہوا' وہ یہ تھا کہ اس اشتہار کو اجرت لے کر بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنی پوزیشن کی کمزوری محسوس کرتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جس فریب میں یہ اپنے ناظرین کو مبتلا کر رہے ہیں' اس کا پردہ چاک ہو جائے گا اگر دوسری جانب کے بیانات ان تک پہنچ جائیں۔

دارالاسلام کے لیے پہلا عطیہ

ادارہ دارالاسلام کے کتب خانے کو کتابوں کا سب سے پہلا عطیہ' ملک عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و حجاز کی طرف سے وصول ہوا ہے جو مذہب حنبلی کی چند بہترین کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس عطیے کے لیے ہم سلطان موصوف کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ عطایا کی فہرست شائع کرنا' اور معطیوں کے شکریے اشتہار کی صورت میں ادا کرنا' ہمارے مسلک کے بالکل خلاف ہے' لیکن خاص طور پر اس عطیے کا ذکر ان صفحات میں اس لیے کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے ہمدردوں کو بھی اس مسرت میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس ادارے کے کارنامے ابھی کچھ نہ سہی' مگر اس کا بنیادی تخیل ایسا ضرور ہے کہ اس نے اول یوم پیدائش ہی میں بیرون ہند کے سلاطین اسلام میں سے ایک کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی' فالحمدللّٰہ علیٰ ذالک۔ (اشارات' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' ترجمان القرآن' جلد ۱۲' عدد ۵' جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ' جولائی ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ایٹمی صلاحیت' قومی سلامتی اور مستقبل کا چیلنج

خورشید احمد

اسلامی جمہوریہ پاکستان ہی نہیں' پوری ملت اسلامیہ کی تاریخ میں' ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کا دن ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ اور ۶ ستمبر ۱۹۶۵ کی طرح یہ دن بھی ہماری تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ ہم نے بجا طور پر اور بڑے حوصلے سے ہر طرح کے دباؤ' دھمکیوں اور اس کے ساتھ ساتھ وعظ و نصیحت اور چکنی چپڑی باتوں کو نظرانداز کر دیا۔ حکومت' فوجی قیادت اور سائنس دانوں کی باہمت ٹیم نے بڑی جرات سے ۲۸ مئی کو پانچ اور ۲۹ مئی کو مزید ایک دھماکا کر کے' امت مسلمہ کی تاریخ میں ایک نیا' روشن اور باوقار باب رقم کیا ہے:۔

قوم نے توڑ کے ایک کہنہ نظام آج کے دن
لی ہے ہاتھوں میں مقدر کی زمام آج کے دن

پاکستان کا' پہلے مسلمان ملک کی حیثیت سے' ایٹمی صلاحیت کا مظاہرہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں' یہ محض بھارت کے حملے پر دہلے (tit for tat) کی حیثیت بھی نہیں رکھتا' یہ کوئی جذباتی فیصلہ اور محض انا کا اظہار بھی نہیں تھا۔ یہ تو ایک تاریخ ساز اقدام ہے جس کے بڑے دور رس فکری' سیاسی' معاشی اور تہذیبی اثرات ہو سکتے ہیں مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے فطری تقاضوں کو کماحقہ پورا کیا جائے۔ ہم اہل پاکستان کی عظیم اکثریت کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں' جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اس تاریخ ساز اور جرات مندانہ اقدام کے برسوں سے منتظر چلے آ رہے تھے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ اس عظیم کارنامے کو محض وقتی مصالح اور معاشی اور مالی زیروبم کی میزان پر نہ تولا جائے بلکہ تاریخ کے موجودہ مرحلے اور عالمی تناظر میں اس کی اصل قدر و قیمت کا پورا پورا احساس کیا جائے۔ نیز مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صحیح حکمت عملی وضع کی جائے اور پوری قوم کو اس کے حصول کی جدوجہد میں شریک کیا جائے' تاکہ اقبال کا یہ خواب

پورا ہو سکے گا۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!!

مغرب کے ردعمل کا پس منظر

سب سے پہلے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح بارود کی دریافت، صنعتی انقلاب، مشینی صنعت اور بڑے پیمانے کی نئی ٹکنالوجی کے ظہور، تیز رفتار زمینی، سمندری اور ہوائی سواری کے استعمال، عالمی سرمایہ کاری اور بین الاقوامی تجارت کے ذریعے معاشی اور سیاسی انقلابات کی راہ ہموار کی گئی اور گذشتہ پانچ صدیوں میں مغربی اقوام کو عالمی سطح پر غلبہ اور قوت حاصل ہوئی ہے، اسی طرح بیسویں صدی کے نصف آخر میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کے صحیح شعور و ادراک کے بغیر امت مسلمہ کے لیے اپنے مستقبل کی شیرازہ بندی مشکل ہے۔

ہم ان میں سے چند اہم ترین پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اول: تہذیبی اور معاشی غلبے کی ہوس: انیسویں صدی کی بڑی عالمی استعماری طاقتیں (برطانیہ، فرانس، اٹلی، اسپین، ہالینڈ اور پرتگال)، بیسویں صدی کے پہلے نصف میں آہستہ آہستہ اپنی بالادستی کھو بیٹھیں اور ان کی جگہ امریکہ اور اشتراکی روس دو عالمی قوتوں کی حیثیت سے ابھرے۔ اس طرح دو قطبی دنیا (bipolar world) وجود میں آگئی۔ بیسویں صدی کے اختتام تک روس بھی عالمی قوت کی حیثیت سے دم توڑ گیا۔ جرمنی اور جاپان، معاشی طور پر دو اہم ترین کامیاب ممالک کی حیثیت سے ابھرنے کے باوجود، ایک عالمی قوت کا مقام حاصل نہیں کر سکے۔ یورپ یورپی اتحاد کی صورت میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے لیکن ابھی تک نہ اپنی شیرازہ بندی مکمل کر سکا ہے اور نہ امریکہ کی دفاعی چھتری ہی سے مستغنی ہو سکا ہے۔ جاپان دنیا کی دوسری مضبوط ترین معاشی قوت ہونے کے باوجود، معاشی اور سیاسی حیثیت سے اپنے وجود کو تسلیم نہیں کروا سکا، بلکہ گذشتہ پانچ سال سے شدید اندرونی خلفشار کا شکار ہے اور اب کرنسی کے شدید بحران کی زد میں ہے جو اس کے عالمی کردار کو محدود کر رہا ہے۔

اس تناظر میں امریکہ واحد عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور یہی اس کا اصل ہدف بھی تھا اور ہے۔ ایک عرصے سے عالمی سیاست کا سارا دروبست کچھ اس طرح تشکیل دیا جا رہا ہے کہ مستقبل میں کوئی دوسری قوت نہ ابھر سکے۔ جہاں کہیں طاقت کا کوئی نیا مرکز رونما ہونے لگتا ہے، اسے کمزور کرنے اور اس کا شیرازہ منتشر کرنے کے لیے، ہر میدان میں کام شروع ہو جاتا ہے۔ تیانامن اسکوائر کے واقعے کو بنیاد بنا کر چین

کے گرد دائرہ تنگ کرنا' جاپان کا معاشی بحران' مشرقی ایشیا کے ابھرتے ہوئے اقتصادی شیروں (tigers) کا شکار' افریقہ کی ترقی کے خوابوں کا چکنا چور ہونا' مشرق وسطیٰ کے تیل کی قوت کا پانی ہو جانا' اور ۱۹۹۱ کی جنگ خلیج' یہ سب اسی امریکی کھیل کے کرشمے ہیں۔

امریکہ کے چوٹی کے مفکر جو خارجہ پالیسی پر اثرانداز ہوتے ہیں' ایک عرصے سے ایک عالمی قوت کی بالادستی اور ایک نظریے کے استیلا کا تصور پیش کر رہے ہیں۔ ان میں کسنجر سے لے کر بریزنسکی' ہنٹنگٹن' فاکویاما اور نائی جونیر جیسے نام شامل ہیں۔ متعدد امریکی صدور' خصوصیت سے کارٹر' ریگن' بش اور کلنٹن وقتاً فوقتاً اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے لیے جو خطوط کار (guidelines) جاری کرتے رہے ہیں' وہ اسی فکر پر مبنی ہیں۔ ان کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ امریکہ کے مقابلے میں کسی متبادل عالمی قوت کو اب یا مستقبل میں' مغربی یورپ' ایشیا اور سابق روس کے علاقوں سے نہ ابھرنے دیا جائے۔ پیٹرک ٹیلر کے الفاظ میں:

To ensure that no rival super power is allowed to emerge in Western Europe, Asia or the territory of the former Soveit Union".

(بحوالہ Bush's Global Backyard از فاکویاما' دی گارڈین' لندن' ۹ ستمبر ۱۹۹۲)

اس سلسلے میں امریکہ کا ہدف صرف اپنے مفاد کا تحفظ ہی نہیں ہے بلکہ دوسرے ممالک کو اس حد تک مجبور کر دینا ہے کہ وہ خود اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی امریکہ کے دست نگر ہوں۔

پیٹرک ٹیلر نے نیویارک ٹائمز میں' مارچ ۱۹۹۲ میں' ان صدارتی ہدایات پر مبنی ایک مضمون شائع کیا ہے۔ ان رہنما اصولوں کا ماحصل یہ ہے کہ:

> امریکہ کو ایک ایسے نئے نظام کے قیام اور تحفظ کے لیے بہ طور قائد آگے بڑھنا چاہیے جو دوسروں کو یہ یقین دلائے کہ انھیں اپنے جائز مفادات کے تحفظ کے لیے بھی' زیادہ جارحانہ انداز اختیار کرنے' یا زیادہ اہم کردار ادا کرنے کا خیال دل میں نہیں لانا چاہیے۔

اس سلسلے میں امریکی صدر کی دفاعی پالیسی کے رہنما خطوط (Defence Policy Guidelines - DPG) کا یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے:

> یہ ہمارے یا دوسری جمہوریتوں کے مفاد میں نہیں ہے کہ پہلے زمانے کی طرف لوٹ جائیں' جب متعدد فوجی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف توازن پیدا کرتی تھیں' جسے ایک سلامتی کا نظام کہا جا سکتا تھا جب کہ علاقائی یا عالمی امن خطرے میں ہوتا تھا۔

اس دستاویز میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ صرف کثیر قطبی (multi-polarity) ہی کا خاتمہ کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کے ذریعے اجتماعی سلامتی (collective security) کے نظام

کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے' تاکہ اصل مرکز اقوام متحدہ نہیں' امریکہ اور صرف امریکہ ہو۔ اگرچہ اقوام متحدہ کو شریک کیا جائے مگر ایک معاون کی حیثیت سے' نہ کہ ایک مرکزی فیصلہ کن قوت کے طور پر۔ فاکویاما کے الفاظ میں:

> دفاعی پالیسی کے لیے امریکی صدر کے راہنما خطوط (DPG)' امریکہ کی اقوام متحدہ کے ذریعے اجتماعی سلامتی کو اہمیت دینے کی جنگ عظیم کے بعد کی روایت' سے مکمل انحراف کا آئینہ دار تھے۔ اقوام متحدہ' جنگ خلیج میں امریکہ کے یک طرفہ اقدامات کے لیے محض دکھاوا (window dressing) تھی۔ اگر اسے امریکی قیادت حاصل نہ ہوتی تو یہ بالکل بے اثر (impotent) ہوتی۔ جیسا کہ DPG میں خود تسلیم کیا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کے ذریعے اجتماعی اقدام امریکی قیادت کا متبادل نہیں بلکہ اضافی (complement) تھا۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کا اصل منصوبہ' دوسرے تمام ممالک کو عسکری' معاشی' سیاسی اور تہذیبی اور ثقافتی طور پر اتنا مغلوب اور غیر موثر بنا دینا ہے' کہ وہ اس کی بالادستی کو طوعاً و کرھاً قبول کر لیں۔

دوم: مسلم قوت سے اندیشہ: اس پس منظر میں' عالم اسلام کی آزادی اور ۵۶ آزاد مسلمان ملکوں کا وجود میں آنا' مشرق وسطیٰ میں تیل کی قوت کی بنیاد پر نئی معاشی قوت کا حصول' جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان ممالک کا معاشی قوت کی حیثیت سے ابھرنا' حتیٰ کہ جرمنی' جاپان' چین اور کوریا کا معاشی قوت کی حیثیت سے ترقی کرنا' امریکہ کے اس نقشہ جنگ میں' کباب میں ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے انھیں قابو کرنا' کمزور اور غیر مستحکم رکھنا اور اس کے لیے نت نئے حربے اختراع کرنا' نئی عالمی سیاست کا لازمی حصہ ہیں۔

سوم: ٹکنالوجی کی اہمیت: بیسویں صدی کے آخری نصف میں' ٹکنالوجی کے میدان میں' کچھ ایسی ترقیاں ہوئی ہیں جو ایک طرف امریکہ کی اس بالادستی کو قائم کرنے کا موثر ذریعہ بنی ہیں تو دوسری طرف ان کے عام ہونے کا خطرہ اور امکان بھی پیدا ہو گیا ہے اور یہ امریکہ کی عالمی بالادستی کے لیے چیلنج پیدا کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایٹم کے انتشار سے پیدا ہونے والی قوت' میزائل کے کم خرچ' موثر اور دورمار ہتھیار کی صلاحیت اور کمپیوٹر ٹکنالوجی کے ذریعے علم کے حصول' ارتکاز اور ابلاغ کے انقلابی امکانات نے' رواں صدی کے ان آخری برسوں میں' ملکوں اور قوموں کی صلاحیت کار' پیداوار دولت اور توازن قوت' سب کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے اور آنے والی صدی میں یہ نقشہ مزید تبدیل ہو گا۔

ان تینوں صلاحیتوں سے آراستہ ہونے کے لیے' اس پورے تاریخی عمل سے گزرنا ضروری نہیں جس

سے آج کے ترقی یافتہ ممالک' دو صدیوں میں گزرے ہیں۔ ان کے استعمال کے لیے' اتنی مالی صلاحیت بھی درکار نہیں جو مغرب نے اپنی قوت اور سطوت کے قیام کے لیے صرف کی ہے۔ ان کے ذریعے وقت کی قوتوں کو چیلنج کرنے کے لیے مساوی قوت کی بھی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لیے صرف ایک نہایت ضروری موافق ترین (critical optimum) صلاحیت درکار ہے اور پھر یہ صلاحیت روایتی اسلحہ کی ساری قوت کو غیر موثر بنا دینے' اور جنگ اور قوت کے استعمال کو خارجہ پالیسی کے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کو کچھ موثر کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور مغربی اقوام ان صلاحیتوں کے پھیلاؤ کے بارے میں اتنی حساس ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ ایک طرف ان پر امریکہ کی اجارہ داری قائم و مستحکم رہے اور دوسری طرف عالمگیریت (globalization) کے نام پر' قوت کے موجودہ عدم توازن کو دوام بخشنے کی جارحانہ جدوجہد کی جائے۔ سارا کھیل ہی یہ ہے کہ عسکری' معاشی و مالی' علمی و سائنسی قوت امریکہ اور اس کے حلیفوں کے ہاتھوں میں مرکوز رہے اور دشمن مقابلے پر نہ آ سکیں۔ ایک طرف ایٹمی ٹکنالوجی' اعلیٰ قوت کے حامل کمپیوٹر' میزائل اور اسی نوعیت کی صلاحیت کار دوسری اقوام کو حاصل نہ ہو اور دوسری طرف عالمی سرمایہ اور تجارت کو' ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور مغربی افکار و ثقافت کو' وسائل سے مالا مال غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے ذریعے' نئے استعمار کی بالادستی (hegemony) کا تانا بانا بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔

امریکہ کے امتیازی ہتھکنڈے: پاکستان کے جوہری تجربات پر جو عالمی واویلا ہے' اسے سمجھنے کے لیے' امریکی عالمی نظام کے ان خدوخال کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس پس منظر سے صرف نظر کر کے جو بھی حکمت عملی بنائی جائے گی' وہ نہ صرف غیر حقیقت پسندانہ ہو گی بلکہ مہلک (suicidal) بھی ہو سکتی ہے۔

اس عالمی تناظر میں جس بات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اور امت مسلمہ کو' اپنے حقیقی مقام سے محروم رکھنے اور ان کے تاریخی کردار کو سبوتاژ کرنے میں' صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ بھارت اور اسرائیل بھی ایک خاص کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس پہلو کو بھی صحیح طور پر سمجھے بغیر کوئی مناسب حکمت عملی وضع نہیں کی جا سکتی۔

بظاہر پچھلے پچاس سال میں' امریکہ اور پاکستان کی دوستی ہماری خارجہ اور دفاعی پالیسی کا مرکزی ستون رہی ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان کا روس کے مقابلے میں امریکہ کا دورہ' محمد علی بوگرہ کے زمانے میں امریکہ کے عالمی دفاعی نظام میں پاکستان کی شرکت' امریکی امداد کی زنجیروں کو تحفظ سمجھ کر اپنے کو پابند سلاسل کر لینا' جنرل ایوب خان کا بحیثیت سربراہ فوج (۱۹۵۴) امریکہ سے دفاعی رشتے کو استوار کرنا اور پھر ۱۹۵۸ میں برسراقتدار آ کر ملک کو امریکی حکمت عملی کا حاشیہ بردار بنا دینا --- وہ اقدامات ہیں' جو ہماری خارجہ اور دفاعی سیاست کے اصل صورت گر رہے ہیں۔ بعد کے نشیب و فراز اپنی جگہ' مگر امریکہ پر

ہمارا انحصار اور بحیثیت مجموعی امریکی عالمی سیاست میں اس کا حلیف ہی نہیں بلکہ بے دام پٹھو ہونا، ہماری پہچان بن گئے۔ لیکن اگر گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ دوستی بڑی حد تک یک طرفہ تھی۔ امریکہ نے ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ملک میں ایک ایسا مفاد یافتہ طبقہ پروان چڑھایا جو شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے آلہ کار کی حیثیت سے قوت و اقتدار کے اعصابی مراکز پر قابض رہا۔ مگر اس سب کے باوجود امریکہ نے کبھی ہمارے مفاد کو عزیز نہیں رکھا بلکہ آزمایش کی ہر گھڑی میں، ہم سے بے وفائی کی۔ ستم یہ ہے کہ اس کے علی الرغم، یہ برسراقتدار طبقہ، امریکہ ہی کی حاشیہ برداری کرتا رہا اور کر رہا ہے۔

امریکہ بھارت سرگرم تعاون : کشمیر کے مسئلے پر ایڈمرل نمنز اور ڈکسن نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے میں اصل رکاوٹ ہے مگر اس پر کوئی موثر دباؤ نہ ڈالا گیا۔ ۱۹۶۲ میں جب بھارت نے امریکہ کی شہ پر چین پر حملہ کیا اور منہ کی کھائی تو صدر کینیڈی نے پاکستان کو اسلحہ اور پرزوں کی رسد روک دی، کشمیر پر کارروائی کرنے سے منع کیا، بھارت کے نام نہاد غیر جانب دار ملک ہونے کا ڈھونگ برقرار رکھتے ہوئے اس کی دفاعی مدد کی اور چین کے مقابلے پر اسے تیار کرنے کے لیے، آج تک اسے ہر سہولت دے رہا ہے۔ بھارت کی ایٹمی صلاحیت کو فروغ دینے میں امریکہ، کینیڈا اور اسرائیل کا کلیدی کردار ہے۔ کارٹر سے لے کر کلنٹن تک تمام امریکی صدور نے ۱۹۷۴ کے جوہری دھماکے کے باوجود بھارت کی بھرپور مدد کی ہے، اور اسے ایٹمی ری ایکٹروں سے لے کر بھاری پانی (heavy water) کی رسد اور اعلیٰ صلاحیت کے کمپیوٹرز تک فراہم کیے ہیں۔ فنی ماہرین کے میدان میں بھی معاونت جاری رہی ہے۔ ایک طرف "دوست" پاکستان پر معاشی و فوجی پابندیاں رہی ہیں تو دوسری طرف "غیر وابستہ" اور "روس نواز" بھارت کو ہر طرح کے الطاف و عنایات سے نوازا جاتا رہا۔

ناقابل تردید حقائق گواہ ہیں کہ بھارت نے ۱۹۵۵ میں، امریکہ کے "ایٹم برائے امن پروگرام" کے سائے تلے، امریکہ اور کینیڈا سے جوہری ٹکنالوجی اور جوہری مواد حاصل کیا۔ ۱۹۷۴ کے بھارتی دھماکے میں استعمال کیا جانے والا پلاٹونیم، بمبئی کے قریب ٹرامبے کے ری پراسیسنگ پلانٹ سے حاصل کیا گیا جو امریکہ کی امداد، فنی تعاون اور مردان کار کی مدد سے تعمیر کیا گیا۔ ۱۹۷۴ کے دھماکے کے بعد بھارت کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا بلکہ مراعات کی بارش اور تعاون جاری ہے۔

خود امریکی ذرائع، جن میں کارنیگی فاؤنڈیشن کی رپورٹوں سے لے کر کانگرس کی ڈیفنس اور انٹیلی جنس کمیٹیوں کی کارروائیاں، اخباری مضامین اور تحقیقی کتب شامل ہیں، کم از کم گذشتہ ۱۵ سال میں بار بار یہ اطلاع دیتے رہے ہیں کہ بھارت کے پاس ۳۵ سے ۶۵ جوہری بم اور مزید ۱۰۰ سے ۲۰۰ بم بنانے کا تیار شدہ مواد موجود ہے۔ اور اب جون ۱۹۹۸ کے جینز انٹیلی جنس ریویو (Jane's Intelligence Review) کے مطابق، اگر

اس تمام جوہری مواد (بہ شمول تجارتی مقاصد کے لیے تیار کردہ مواد) کا جائزہ لیا جائے جو ٹرامبے اور دھروا کے ریسرچ ری ایکٹرز سے تیار ہوا ہے تو Weapon-Grade Plutonium (ایٹمی اسلحہ سازی کے لیے درکار پلوٹونیم) کا ذخیرہ ۳۹۰ سے ۴۰۷ ایٹم بم بنانے کے لیے کافی ہے۔ اگر اس صلاحیت کا موازنہ واشنگٹن کی نیشنل ریسورس ڈیفنس کونسل کی دسمبر ۱۹۹۶ تک کی معلومات پر مبنی رپورٹ سے کیا جائے تو یہ صلاحیت برطانیہ، چین اور فرانس کی جوہری صلاحیت سے قریب تر ہے۔ جس کی رو سے برطانیہ ۲۶۰ جوہری بم، چین ۴۰۰ جوہری بم اور فرانس ۴۵۰ جوہری بم کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جینز انٹیلی جنس ریویو (جون ۱۹۹۸) کے مطابق، ۱۱ مئی ۱۹۹۸ کے بھارتی دھماکے میں استعمال ہونے والا مواد (Tritum)، بھابھا اٹامک سینٹر بمبئی سے حاصل کیا گیا تھا جو ۱۹۹۲ میں بڑی طاقتوں کی مدد سے قائم کیا گیا۔ اسی طرح ناقابل تردید ذرائع کی شہادت ہے کہ ۱۱ اور ۱۳ مئی کے دھماکوں میں انھیں داغنے (firing system) کی صلاحیت کو بھی آزمایا گیا۔ کم وقت میں متعدد دھماکوں کو ممکن بنانے کا یہ سسٹم، اسرائیل نے امریکہ کی آشیرباد سے فراہم کیا۔

۱۹۹۵ میں امریکی صدر کی خصوصی اجازت سے، امریکہ سے بھاری پانی کھلے بندوں بھارت کو فراہم کیا گیا۔ نیز اعلیٰ صلاحیت کے کمپیوٹر دیے گئے جن کا بھارتی بم اور میزائل کے بنانے میں کلیدی کردار رہا۔ اس طرح بھارت کے نیوکلیر سائنس دان، بشمول ڈاکٹر عبدالکلام، امریکہ میں ایٹمی ریسرچ کے اداروں سے وابستہ رہے اور مسلسل ان کے پروگراموں میں شریک رہے۔ ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ میں، ایک ہزار ایک سو بھارتی سائنس دانوں اور انجینیروں نے امریکہ کے ایٹمی ریسرچ اداروں یا ری ایکٹروں میں تربیت حاصل کی ہے۔

بھارت کا پہلا نیوکلیر ری ایکٹر، کینیڈا کے ڈیٹیریم یورنیم ری ایکٹر کی مدد سے بنا۔ جنرل الیکٹرک نے یورنیم افزودگی کا ری ایکٹر، فرانس کے مقابلے میں دو تہائی قیمت، ۱۲۶ ملین ڈالر پر فراہم کیا۔ اس طرح شمال میں تاراپور کا ایٹمی پاور اسٹیشن وجود میں آیا اور فلاڈلفیا کی کلجیان (Kuljian) کارپوریشن، واشنگٹن کی نیوکلیر یوٹیلٹی سروس اور امریکہ کی دفاعی تعمیرات کی ماہر فرم بیچٹل (Bechtel) کارپوریشن کے عملی تعاون اور یو ایس ایڈ کے فراہم کردہ ۸۰ ملین ڈالر کی امداد سے یہ لوارہ قائم ہوا۔ نیز امریکہ کے جوہری توانائی کے کمیشن نے آغاز کار کے لیے ۱۳.۵ ڈالر مالیت کا ابتدائی افزودہ یورنیم فراہم کیا۔

تاراپور کے ری ایکٹر پر کام، امریکی امداد سے ۱۹۶۵ کی جنگ سے ایک سال پہلے یعنی اکتوبر ۱۹۶۴ میں شروع ہوا اور پاکستان پر بھارت کی جنگی یلغار کے باوجود جاری رہا، تاآنکہ یہ ری ایکٹر ۱۹۶۹ میں مکمل ہوا۔ امریکہ نے یورینیم کی افزودگی کے اس عمل میں کھلے بندوں ۱۹۷۴ تک شرکت کی اور اس طرح بھارت نے وہ دھماکا کیا جو مئی ۱۹۷۴ میں "بدھا کی مسکراہٹ" کے نام پر ہوا۔ پوکھران کے اس پہلے دھماکے سے قبل، ساڑھے چار سال میں، امریکہ نے بھارت کو ۱۵۰ ٹن یورنیم افزودہ ایندھن فراہم کیا۔ گویا ۱۹۷۴ کے دھماکے

کے بعد بظاہر پابندیوں کا اعلان کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۰ کے درمیان امریکہ نے ۹۰ ٹن ایٹمی ایندھن بھارت کو خود فراہم کیا اور باقی کسر فرانس کے ذریعے پوری کرا دی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ میں امریکہ کی کانگرس نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کا قانون منظور کیا۔ جس کے بعد ہر ایسے ملک کے لیے جوہری مواد ہی نہیں، ہر صورت میں تعاون ختم کیا گیا جو این پی ٹی کا حصہ نہ ہو اور اپنے جوہری پروگرام کو بین الاقوامی نگرانی سے مستثنیٰ رکھے۔ اس قانون کے تحت پاکستان پر پابندیاں لگائی گئیں جو مختلف صورتوں میں ۱۹۷۹ سے اب تک جاری ہیں۔ لیکن بھارت کے لیے، جس نے نہ این پی ٹی پر دستخط کیے اور نہ اپنے ری ایکٹروں اور جوہری اداروں کو مکمل طور پر عالمی نگرانی کے لیے کھولا، امریکہ سے نیوکلیر برآمدات جاری رہیں۔ صدر کارٹر جب جنوری ۱۹۷۸ میں بھارت گئے تو بھارتی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کے مزید جوہری رسد کے مطالبے پر، کارٹر نے موصوف کے کان میں چپکے سے کہا کہ: "فکر نہ کرو میں ساڑھے سات ٹن مواد کی ترسیل کے احکامات جاری کروں گا"۔ بھارت اس کے باوجود ھل من مزید کہتا رہا اور کارٹر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ: "ہم بھارت کی ناراضی مول نہیں لے سکتے"۔ اس کے الفاظ تھے:

"We think twice before we incur the disapproval of India".

بھارت نے امریکہ کے علاوہ ناروے سے بھی جوہری تعاون حاصل کیا اور اس کی پشت پر بھی سی آئی اے کا ہاتھ تھا۔ کھلے اور چھپے یہ تعاون کسی انقطاع کے بغیر برابر جاری رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۹۸ کے دھماکے کے بعد، ۱۳ مئی کو جب بھارت دو مزید دھماکے کر رہا تھا، اسی دن امریکی کمپنیاں پرتھوی اور اگنی میزائل بنانے والے اداروں کو اعلیٰ صلاحیت والے کمپیوٹروں کا سافٹ ویر روانہ کر رہی تھیں۔ اس کا انکشاف حال ہی میں ایک سائنس دان، گیری مل ہلن نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ (دی نیشن، لندن، ۹ جون ۹۸)۔

۱۱ مئی ۹۸ کے دھماکوں کے بارے میں سی آئی اے کی آنکھ مچولی کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ مئی کے پہلے ہفتے میں بھارت کے خارجہ سیکرٹری نے امریکہ کا دورہ کیا۔ اس سے کچھ پہلے اقوام متحدہ میں امریکہ کے سفیر رچرڈسن نے بھارت اور پاکستان کا دورہ کیا اور بھارت کے دورے کے بارے میں فرمایا کہ "دونوں کے خیالات میں جتنی ہم آہنگی اس وقت ہے، کبھی نہ تھی"۔ رہا سی آئی اے کا یہ ڈراما کہ انھیں دھماکے کی خبر نہ تھی، اس کے بارے میں بھی بھارت کے روزنامہ دی ایشین ایج (۱۸ مئی ۹۸) میں، اس کے چیف ایڈیٹر کا مضمون بڑا چشم کشا ہے۔ موصوف امریکہ اور سی آئی اے کے اعلیٰ ذرائع کے حوالے سے لکھتے ہیں:

بہرکیف ہمارے سیٹلائٹ نے، دھماکوں سے چند روز پہلے پوکھران پر سرگرمی کا پتا چلا لیا تھا لیکن واشنگٹن میں کسی نے بھی اسے دھماکوں سے متعلق نہ سمجھا۔ سیٹلائٹ بالکل ناکام بھی نہیں ہوا۔

معائنہ ٹیموں کو، دھماکے کیے جانے سے پورے چھ گھنٹے پہلے (اتوار، پیر کی درمیانی رات کو) واشنگٹن میں واضح شہادت دستیاب تھی۔ نظری طور پر امریکہ کے پاس کافی وقت تھا کہ سفارتی سطح پر ضروری اقدام کرتا یا میڈیا کے ذریعے الارم بجاتا۔

اس پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور اس کے جاسوسی ادارے سو نہیں رہے تھے، خاموشی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس پر مزید روشنی امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان جیمز پی روبن (James P. Robin) کی پریس بریفنگ سے ہوتی ہے جو دھماکے کے فوراً بعد (۱۱ مئی ۹۸) کو دی گئی۔

سوال: کیا امریکہ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بھارت دھماکے کرنے والا ہے کیونکہ بھارتی وزیر خارجہ گذشتہ جمعہ ۹ مئی کو واشنگٹن میں افسران سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔

روبن: میں نہیں سمجھتا کہ ہمارا کوئی اہل کار یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ آج اس قسم کا اعلان ہونے والا ہے۔

سوال: تو گویا آپ بے خبری میں پکڑے گئے؟

روبن: میں نے یہ نہیں کہا۔ میں نے کہا ہے کہ ان ملاقاتوں میں، میرے علم کی حد تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ یہ ہونے والا ہے۔ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں کسی ایسے معاملے کے بارے میں وہ الفاظ استعمال کر کے بات کروں جو میں نے نہیں کہے، اور اگر آپ وہ لفظ استعمال کریں گے تو میرا جواب نو کمنٹ (no comment) ہو گا۔ (امریکی وزارت خارجہ کی روزانہ بریفنگ، ۱۱ مئی ۱۹۹۸)

گویا۔

خنجر پہ کوئی داغ، نہ دامن پہ کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو، کہ کرامت کرو ہو

اس تناظر میں بھارت کے پورے جوہری پروگرام اور ۱۹۷۴ سے ۱۹۹۸ تک کے دھماکوں کے "پردہ زرنگاری" کے پیچھے جو "معشوق" ہے اسے دیکھنا کوئی مشکل نہیں!

اسرائیل کا تعاون: اس ہولناک ڈرامے کا دوسرا کردار اسرائیل ہے، جس کا بھرپور تعاون بھارت کو ہر میدان میں حاصل رہا ہے لیکن یہ تعاون خصوصیت سے جوہری صلاحیت کی ترقی، جاسوسی، معلومات کی فراہمی اور تنسیق (coordination) اور کشمیر میں تحریک مزاحمت کو کچلنے کی حکمت عملی کی تشکیل کے سلسلے میں سب سے نمایاں رہا ہے۔ نیز بھارت اور اسرائیل میں پاکستان کو جوہری صلاحیت پر نگاہ رکھنے (monitor کرنے) اور اس کو تباہ کرنے کے منصوبوں میں بھی خطرناک گٹھ جوڑ ایک معروف اور معلوم حقیقت ہے۔ ۱۷ مئی ۱۹۹۸ کو اسرائیل نے دھمکی دی تھی کہ اگر پاکستان نے دھماکا کیا تو اس کے جوہری

اسٹیبلشمنٹ پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ (جنگ' لندن' ۱۸ مئی ۱۹۹۸)۔ پھر ۲۷-۲۸ مئی کی درمیانی رات حملے کی پوری تیاری ہی نہیں تھی' بلکہ ابتدائی اقدام بھی کر لیے گئے تھے جو الحمدللہ پاکستان کے چوکس ہونے کی وجہ سے ناکام بنا دیے گئے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لیے مغربی اور بھارتی ذرائع سے شائع ہونے والے صرف چند شواہد پیش کیے جا رہے ہیں۔

دی ٹائمز لندن کا نمایندہ 'کرسٹوفر والر' بیت المقدس سے' اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

بھارت اور اسرائیل کے درمیان' اس سے بہت زیادہ جوہری تعاون رہا ہے جتنا اب تک ظاہر کیا گیا ہے۔ میزائل ٹکنالوجی میں تعاون گذشتہ دو عشروں سے جاری ہے۔ جوہری سائنس دانوں کے درمیان بار بار ہونے والی ملاقاتوں کو خفیہ رکھا گیا' لیکن گذشتہ روز تل ابیب کے اخبارات کے اس انکشاف سے کہ بھارت کے ہیرو' عبدالکلام نے' ۱۹۹۶ میں کم سے کم دو بار' اور گذشتہ سال اسرائیل کا دورہ کیا تھا' بھارت اسرائیل تعاون کے ثبوت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان رپورٹوں کے مطابق میں یہ انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ اسرائیل کے چیف آف سٹاف نے اس ہفتے بھارت کا دورہ اسی خوف سے منسوخ کیا کہ اسے غلط اہمیت دی جائے گی۔ بھارت کے دفاعی تحقیق اور ترقی کے ادارے کے سربراہ ڈاکٹر عبدالکلام اور ان کے ہم مرتبہ اسرائیلی سائنس دان کے درمیان قریبی روابط' ۷۰ کے عشرے کے اواخر میں' ایک ٹیسٹ کے لیے جنوبی افریقہ سے تعاون کی یاد دلاتے ہیں۔ کل' اخبار ہارٹز (Haaretz) نے لکھا: ایک سینئر اسرائیلی سائنس دان کے مطابق ڈاکٹر عبدالکلام نے متعدد بار اسرائیل کا دورہ کیا اور اسی طرح سینئر اسرائیلی سائنس دان دوروں پر بھارت گئے۔ اخبار نے یہ بھی بتایا کہ دہلی کے مرکز برائے پالیسی ریسرچ کے پروفیسر براہما چیلانے نے "گذشتہ ماہ اسرائیل کا دورہ کیا۔ (دی ٹائمز' ۴ جون ۱۹۹۸' ص ۲۱)

اس کی تصدیق' سنڈے ٹیلی گراف کی' ۷ جون ۱۹۹۸ کی اشاعت میں شائع ہونے والی اس رپورٹ سے بھی ہوتی ہے' جو اس کے مضمون نگار ٹام گراس نے بیت المقدس سے بھیجی ہے اور جس میں مارچ ۱۹۹۸ میں بھارت کے چیف آف اسٹاف کے اسرائیل کے دورے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

بھارتی روزنامے دی ایشین ایج نے بھی نہ صرف اس تعاون کا اعتراف کیا ہے' بلکہ ۲۷-۲۸ مئی کے متوقع حملے کی توجیہ صرف نگرانی اور حصول معلومات کی کوشش کے عنوان سے' کی ہے۔ اس کے لندن کے نمایندوں کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل حصہ قابل ملاحظہ ہے:

پاکستان نے غلط طور پر ہی سمجھا ہو کہ بھارت کسی نہ کسی طرح اس پر پہلے ہی حملہ (pre emptive)

کرنے میں شریک تھا لیکن دفاعی ماہرین کا اب کہنا ہے کہ اسرائیل اس خوف سے کہ اسلامی بم تیار نہ ہو جائے' جو بعد میں پڑوس میں ایران اور عراق کو فراہم ہو سکتا ہے' اپنے طور پر کچھ اقدام کر سکتا تھا۔ یہ نگرانی (survillance) اس وجہ سے بھی ہو سکتی تھی کہ اسرائیل' پاکستان کی جوہری سرگرمیوں کے بارے میں امریکہ کی جاسوسی سے مطمئن نہ تھا۔ ابھی تک ماہرین نے اس امکان کو رد نہیں کیا ہے کہ اسرائیلی جہاز اپنے ہی کسی اڈے سے' فضا میں ایندھن حاصل کرتے ہوئے آئے ہوں۔ (دی ایشین ایج' ۴ جون ۹۸)

بھارت کا جوہری پروگرام اور امریکہ' کینیڈا' فرانس' ناروے اور اسرائیل کی اس میں کسی نہ کسی عنوان سے شرکت' ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے۔ پاکستان اور مسلم ممالک کو اس صلاحیت سے محروم رکھنا اور بھارت کو چین کے خیالی خطرے کے نام پر عمومی عسکری قوت ہی نہیں جوہری ہتھیاروں کو تیار کرنے کے لائق بنانا اور بالآخر اسے پاکستان اور اسلامی دنیا کے خلاف استعمال کرنا' وہ زمینی حقائق ہیں جنھیں نظر انداز کر کے خارجہ اور دفاعی پالیسی بنانا' پاکستان اور اہل پاکستان کے لیے' خودکشی کے مترادف ہو گا۔

امریکی پالیسی سازوں کی بدنیتی : اس سلسلے میں امریکہ کے یہودی نژاد سابق وزیر خارجہ اور دانش ور ہنری کسنجر کا وہ انٹرویو غور سے پڑھنے کے لائق ہے' جو اس نے نومبر ۱۹۹۵ میں انڈیا ٹوڈے کو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں کسنجر نے کہا:

سوال: کیا آپ کے خیال میں امریکہ اور بھارت کے درمیان مشترکہ اسٹرے ٹیجک مفادات ہیں؟

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ آپ اسٹرے ٹیجک کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ یقیناً ہم دونوں کا اسی میں مفاد ہے کہ اسلامی سیاست میں' اسلامی بنیاد پرستی کو' غالب قوت بننے سے روکا جائے۔ ہم دونوں کا' وسط ایشیا کی ریاستوں کا اپنے توانائی کے وسائل برآمد کرنے کی قابلیت میں بھی مشترک مفاد ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں' دونوں ممالک میں' دفاعی امور میں تعاون میں اضافہ ہو گا؟

جواب: میری رائے میں ایسا ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جنوری میں ہمارے چیف آف اسٹاف یہاں آ رہے ہیں۔ میں یقیناً اس دورے کو خوش گوار قرار دوں گا۔ (انڈیا ٹوڈے' ۳۰ نومبر ۱۹۹۵)

یہ وہی کسنجر ہیں جنھوں نے پاکستانی وزیراعظم کو دھمکی دی تھی کہ "جوہری توانائی کی طرف نہ بڑھو ورنہ ہم تمھیں سبق سکھا دیں گے اور دوسروں کے لیے نشان عبرت بنا دیں گے"۔

امریکہ کے اس کھلے کھلے امتیازی (discriminatory) رویے کی ایک واضح مثال' ۱۹۸۰ میں امریکہ کے ایک اعلیٰ نمایندے (جس کا نام نہیں بتایا گیا) اور جنرل محمد ضیا الحق کے درمیان ہونے والی وہ گفتگو ہے' جو پاکستان کے سابق ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف' جنرل کے ایم عارف نے اپنی کتاب' Working

With Him میں نقل کی ہے۔ اس گفتگو میں امریکہ کے اعلیٰ نمایندے نے' وہی چین کے خطرے کی بات کر کے' بھارت کی جوہری صلاحیت کا دفاع کیا' این پی ٹی قبول نہ کرنے کی توجیہ کی اور پاکستان کو متنبہ کیا۔ جب دلائل کے باب میں لاجواب ہو گیا تو دل کی بات صاف الفاظ میں یوں ادا کی ہے:

"India has the facilities and we can't do anything about it. But Mr. President, you do not have the capability yet. And America is not going to let you possess it".

بھارت کے پاس سہولتیں ہیں اور ہم اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے لیکن جناب صدر! آپ کے پاس ابھی تک صلاحیت نہیں ہے اور امریکہ آپ کو یہ حاصل نہیں کرنے دے گا۔

ہم نے جو حقائق اوپر بیان کیے ہیں' ان کی روشنی میں بالکل فطری طور پر یہ چار نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ بھارت کو جوہری صلاحیت سے آراستہ کرنے میں' بھارت کے اپنے عزائم اور کوششوں کے ساتھ' امریکہ اور مغربی اقوام کا منظم تعاون حاصل رہا ہے' اور بالآخر بھارت کو جوہری ہتھیاروں سے آراستہ ایک علاقائی سوپر پاور بنانا مذکورہ طاقتوں کے منصوبے کا حصہ ہے۔ پاکستان اور امت مسلمہ کو اس سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے اور اپنی لمبے عرصے کی حکمت عملی (long term planning) مرتب کرنے میں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔

۲۔ بھارت کا اولیں ہدف پاکستان ہے' لیکن بالآخر اس کے سامنے' ایشیا اور شرق اوسط میں' اپنی بالادستی کا قیام ہے۔ اس سلسلے میں اسرائیل کے ساتھ اس کی ساز باز ہی نہیں وسیع پیمانے پر مشترکہ حکمت عملی اور دفاعی اور عسکری امور میں عملی تعاون ہے۔ اسرائیل اور بھارت کو اس پورے علاقے میں اپنا قائم مقام (surrogate) بنانا اور ان کو ایک غنڈہ ریاست (Bully State) کا کردار دینا' امریکہ کے عالمی نظام کا حصہ ہے۔

۳۔ امریکہ اور مغربی اقوام کے امتیازی سلوک کا اصل ہدف پاکستان اور امت مسلمہ ہیں۔ عملاً بھارت کو ایک جوہری طاقت بنایا گیا ہے اور آیندہ بھی اسے مراعات و سہولیات دی جائیں گی۔ اصل منصوبہ پاکستان' عرب اور مسلم ممالک کو جوہری صلاحیت سے محروم رکھنا تھا اور ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اکیسویں صدی میں وہی قومیں اور ممالک اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکیں گے' جن کے پاس کوئی قابل اعتماد سدجارحیت (credible deterrence) ہو۔ روایتی جنگی سازوسامان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن محض روایتی (conventional) فوجی سازوسامان اپنی تمام مہنگی قیمت کے باوجود ایک قابل اعتماد دفاعی حصار قائم نہیں کر سکتا۔ آج اور آنے والی صدی میں' یہ استعداد صرف جوہری اور میزائل پر مبنی سدجارحیت ہی سے حاصل

ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے محروم رکھ کر ان ممالک کو تر نوالہ بنا کر اپنا تابع مہمل رکھنا مقصود ہے۔

۴۔ پاکستان پر اصل غصہ اسی وجہ سے ہے کہ اس نے اس حکمت عملی کو بڑی حد تک ناکام بنا دیا ہے۔ ساری مخالفتوں' پابندیوں' سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے' اس نے نہ صرف یہ کہ جوہری صلاحیت حاصل کر لی ہے' بلکہ اب اس کا عملی اظہار بھی کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ دباؤ پاکستان ہی پر ہے اور اسے ناکوں چنے چبوانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

بھارت نے دھماکے کیوں کیے؟

نئے عالمی نظام اور اس کے ان اہداف پر گفتگو سے' جو پاکستان اور امت مسلمہ کے بارے میں' اس کے پیش نظر ہے' ۱۱ اور ۱۳ مئی کے بھارتی جوہری دھماکوں کی اصل غایت کو سمجھنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ یہ لمبے عرصے کی حکمت عملی کا ایک لازمی حصہ تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خاص اس وقت یہ دھماکے کیوں کیے گئے؟ ہماری نگاہ میں اس کی تین اہم وجوہ ہیں:

پہلی وجہ : ایشیا اور شرق اوسط کے بارے میں' بھارت کے عزائم اور ان عزائم کے حصول کے لیے امریکہ کی تائید سے عالمی فضا بنانا ہے۔ بھارت کا خیال ہے کہ اعلان شدہ جوہری صلاحیت کے بغیر' اسے ایک چھوٹی عالمی اور بڑی علاقائی طاقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے بغیر اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ویٹو بردار مستقل ممبر بنایا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایٹمی کلب کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہی اس پوزیشن کو حاصل کر سکتا ہے۔ دھماکے پر فوری ردعمل کے طور پر کچھ رسمی لعن طعن اور پابندیوں کا ڈراما' سب اس کھیل کا حصہ ہیں۔ تھوڑی سی فوں فاں کے بعد نئے مذاکرات شروع ہو جائیں گے اور تھوڑے بہت مول تول کا مظاہرہ کر کے مطلوبہ حیثیت حاصل کر لی جائے گی۔ اس کام کے انجام دینے کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی سے بہتر کوئی آلہ کار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ پارٹی ہندو قوم پرستی کی علم بردار ہے اور اس کے پاس ایسے منظم کارکن ہیں جو پورے ملک کو متحرک کر سکتے ہیں۔ نیز بھارت کی عظمت اور بالادستی کے قیام کو یہ اپنا اصل مقصد قرار دیتی ہے اور اس کے لیے ملک کو ہر قربانی اور اس کے عوام کو ہر قیمت ادا کرنے پر تیار کر سکتی ہے۔ جوہری اسلحہ کو فوجی نظام کا حصہ بنانا' اس کا اولین ہدف رہا ہے۔ پارٹی کے منشور میں اس کا اعلان کیا گیا ہے اور ۱۹۹۸ کے انتخاب کے لیے جو منشور اس نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا' اس میں اس کا جلی حروف سے ذکر تھا۔

خارجہ پالیسی کے باب میں کہا گیا ہے:

بی جے پی کی حکومت عالمی سطح پر ایک نمایاں مقام کا مطالبہ کرے گی۔ بی جے پی جوہری امتیاز

(apartheid) کے تصور اور سی ٹی بی ٹی' ایف ایم سی آر (FMCR) اور ایم ٹی سی آر (MTCR) کے ذریعے جوہری بالادستی کو مسترد کرتی ہے۔ ہم اپنے سلامتی کے معاملات میں اور جوہری اختیار (option) استعمال کرنے میں کسی سے حکم نہیں لیں گے۔ ہم مستقل مزاجی سے قومی مقاصد اور اہداف کی لیے کوشش کریں گے۔ مختصراً' وہ یہ ہیں۔ ○ بھارت کو اس کے سائز اور صلاحیت کے تناسب سے دنیا میں کردار اور پوزیشن دینا۔ ○ بھارت کو سلامتی کونسل کا مستقل ممبر بنانے کے لیے بھرپور کوشش کرنا۔ ○ پاکستان کو ہمارے قومی معاملات میں دہشت گرد گروہوں کی حمایت کے ذریعے سرگرم مداخلت کی پالیسی ترک کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے فعال اقدامات کرنا۔ ○ بی جے پی' جموں اور کشمیر کے مکمل علاقے پر بشمول بیرونی مقبوضہ علاقوں کے' بھارت کی حاکمیت اعلیٰ غیر مبہم طور پر اعلان کرتی ہے۔ (انتخابی منشور' ۱۹۹۸' ص ۲۹' ۳۰)

قومی سلامتی کے باب میں اگلے ہی صفحے پر وعدہ کیا گیا ہے کہ:

- ملک کی جوہری پالیسی کا از سر نو جائزہ لینا اور جوہری اسلحے کے آغاز کا اختیار استعمال کرنا۔
- میزائل کے اگنی سلسلے کی ترقی کو تیز تر کرنا تاکہ ان کی حد اور نشانے کی درستی بہتر ہو۔
- طاقت کے دائرہ اثر کو مناسب تکنیکی اقدامات (میدان جنگ میں نگرانی کا نظام' فضا میں ہی ایندھن بدلنے کا انتظام) کے ذریعے بڑھانا۔
- بیرونی جاسوسی نظام کی فنی صلاحیت بڑھانا۔

انتخاب کے بعد بی جے پی اور حلیف جماعتوں نے جو قومی ایجنڈا مرتب کیا اور جس پر عمل درآمد کا عہد کیا' اس میں بھی کہا گیا ہے کہ:

ہم عالمی میدان میں بھارت کو وہ مقام' رول اور پوزیشن دلوانے کے لیے کوشش کریں گے جو ہمارے سائز اور صلاحیت سے مناسبت رکھتا ہے۔

ہم جوہری پالیسی کا دوبارہ جائزہ لیں گے اور جوہری اسلحے کا آغاز کرنے کا اختیار استعمال کریں گے۔ (نمبر ۲۶ اور ۲۸)

اب یہ کوئی راز نہیں کہ واجپائی صاحب جب دو سال پہلے تیرہ دن کے لیے وزیراعظم بنے تھے تو پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ سائنس دانوں کو بلا کر یہ معلوم کیا کہ دھماکا کتنے دن میں ہو سکتا ہے۔ پھر ۱۹۹۸ میں بھی برسر اقتدار آکر' ڈیفنس ریویو کے ضابطے کو پورا کیے تمام شریک حکومت جماعتوں کو اعتماد میں لیے بغیر' دھماکے کی تیاری کے احکامات جاری کیے۔ نیز ان کے وزیر دفاع نے "چینی خطرے" کا راگ اونچے سروں میں الاپنا شروع کر دیا بلکہ خیالی ہیلی پیڈز کا افسانہ بھی اختراع کر ڈالا۔ جموں اور کشمیر میں گرمی پیدا کی' سیاچین

کا دورہ کیا اور جھڑپیں شروع کیں۔ یہ سب فضا بنا کر ۱۱ اور ۱۳ مئی کے دھماکے کیے اور عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے سفارتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ کیا، جس میں سیکرٹری خارجہ کا امریکی دورہ سرفہرست آتا ہے۔ یہ دھماکے اسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھے جس میں بھارت کے ساتھ دوسرے بھی پس پردہ شریک تھے اور ان کا مقصد بھارت کے لیے ایک خاص عالمی مقام حاصل کرنا تھا۔

۲۔ دوسری بنیادی وجہ پاکستان کو کونے میں لگانا ہی نہیں بلکہ اس کے گرد گھیرا تنگ کرنا تھی۔ گذشتہ دس سال سے، دونوں ممالک کے بارے میں یہ اندازہ تھا کہ ان کے پاس جوہری صلاحیت موجود ہے اور عملاً دھماکا کیے بغیر بھی وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ ایک دوسرے کو ایٹمی جواب دے سکتے ہیں۔ اس سے وہ صورت حال رونما ہوئی جسے استرےٹیجک ابہام (ambiguity) کہا جاتا ہے اور بظاہر یہ ٹھیک ٹھیک سد جارحیت کا کام انجام دے رہی تھی۔ چونکہ بی جے پی کے مقاصد میں، پاکستان پر حملہ اور خصوصیت سے کشمیر میں بڑا اقدام کرنا شامل تھا، اس لیے اس نے اس ابہام کو ختم کر کے دھماکے کے ذریعے اپنے کو ایک ایٹمی اسلحے سے لیس ریاست بنانا ضروری سمجھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ اگر پاکستان کے پاس فی الحقیقت مقابل کی قوت ہے تو وہ بھی دھماکا کر کے اپنی صلاحیت کو منوا لے، اور اگر وہ دھماکا نہیں کرتا تو مطلب یہ ہوتا کہ یا وہ اس صلاحیت سے عاری ہے اور اس طرح نئی جارحیت کے لیے سبز جھنڈی دے دے اور یا کسی ایٹمی ملک کی چھتری حاصل کر کے ایک کمزور اور باج گزار ریاست کا درجہ قبول کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۱ اور ۱۳ مئی کے دھماکوں کے بعد، بھارت نے پاکستان پر تقریباً ہر محاذ پر اور خاص طور پر کشمیر میں دباؤ بڑھا دیا اور دوسری طرف ساری عالمی قوتوں نے پاکستانی حکومت پر بھرپور دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ دھماکا نہ کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ذرا غور کیجیے کہ وہ صدر کلنٹن جو پاکستان کے وزیراعظم کے امریکہ کے سرکاری دورے پر، ان کو ملاقات کے لیے خود اپنے دفتر میں بیس منٹ سے زیادہ وقت دینے کو تیار نہ تھے، وہ سترہ دن میں پانچ بار ٹیلی فون کرتے ہیں اور ہر بار ۲۰ اور ۲۵ منٹ تک بات کرتے ہیں، اعلیٰ سیاسی اور عسکری وفود بھیجتے ہیں اور ترغیب اور ترہیب (carrot and stick) کا ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ برطانیہ اور جاپان کے وزراے اعظم، فرانس کے صدر، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، سبھی متحرک ہو جاتے ہیں۔ بھارت پر کسی موثر دباؤ کا فقدان اور پاکستان کے لیے تمام نصائح، ترغیبات اور دھمکیاں گویا۔

نصیحت رات دن ناصح کیا کرتے ہو تم ناحق
اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

بلاشبہ یہ پاکستان پر بڑا بھرپور وار تھا اور پاکستانی حکمران ایک گونہ تذبذب کا شکار تھے۔ امریکی اخبارات و رسائل نے، صدر کلنٹن اور پاکستانی وزیراعظم کی گفتگو کی جو تفصیلات شائع کی ہیں، ان سے پاکستان کی

قیادت کی مشکلات کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن شکر الحمدللہ! بالآخر پاکستانی قوم کے عزم اور حوصلے، اس کی سیاسی اور دینی جماعتوں کی ملک گیر تحریک، اردو صحافت اور کالم نگاروں کا جرات مندانہ اظہار حق، خود حکمران پارٹی میں جوابی کارروائی کے لیے موثر آواز کا ظہور، فوجی قیادت کی بالغ نظری اور ایٹمی سائنس دانوں اور انجینیروں کی ٹیم کی مستقل مزاجی فیصلہ کن ثابت ہوئی اور حکومت نے وہ اقدام کیا جو قوم کے دل کی آواز اور ملت اسلامیہ کی عزت اور بقا کا تقاضا تھا۔

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمام گلستاں کریں گے ہم

اگرچہ بھارت کے ان دھماکوں کے پیچھے بھارتی حکومت کی اندرونی کمزوریاں اور مخلوط حکومت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا ایک طرح سے یرغمالی (hostage) بن جانا بھی تھا، جس سے نکلنے اور اپنے انتخابی امکانات کو بڑھانے کے لیے بھی یہ دھماکے اس کی ضرورت بن گئے تھے۔ جس کا اظہار خود بھارتی پارلیمنٹ میں ان دھماکوں پر ہونے والی بحث میں بار بار کیا گیا۔ لیکن ہماری نگاہ میں اصل وجہ وہی عالمی سیاسی کھیل اور پاکستان کو گھیرنے اور طفیلی مقام پر رکھنے کی حکمت عملی تھی۔

اس دھماکے کی تیسری وجہ مسئلہ کشمیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت اور امریکہ نے خود کشمیر کے مسئلہ کے "حل" کے لیے بھی اسے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ ہدف یہ تھا کہ اگر پاکستان حقیقی اور موثر ایٹمی سدجارحیت نہیں رکھتا تو فوری طور پر کشمیر میں اقدام کیا جائے۔ ایٹمی اسلحہ کے پرزور دباؤ کے ذریعے بلیک میل کیا جائے اور پھر عالمی برادری بیچ بچاؤ کرا کے موجودہ لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد کی حیثیت دے کر مسئلے کو ختم کر دے۔ پاکستان، بھارت کی ایک طفیلی ریاست بن جائے، فوج کی تخفیف کرا دی جائے اور کشمیریوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔

الحمدللہ، یہ کھیل کامیاب نہ ہو سکا۔ ومکروا ومکر اللہ ؕ واللہ خیر الماکرین ○ (آل عمران ۳:۵۴) "وہ اپنی چال چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور بلاشبہ اللہ بہترین تدبیر کار ہے"۔ پاکستان نے چھ کامیاب تجربے کر کے، نہ صرف اپنی ایٹمی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا بلکہ کچھ پہلوؤں سے اپنے جوہری پروگرام کی برتری بھی ثابت کر دی جس نے پاکستان ہی نہیں، پوری امت مسلمہ کے مورال کو بلند کیا۔ عالمی بساط پر "شہ مات" کا جو نقشہ بنایا گیا تھا وہ الٹ گیا۔

سو سالہ دور جام تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

مستقبل کے چیلنج' درست حکمت عملی

پاکستان کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا اور الحمدللہ اس نے اس راستے کو بروقت اور صحیح انداز میں اختیار کیا۔ فطری طور پر اس کے مثبت اور منفی دونوں اثرات رونما ہوئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اثرات کا جائزہ لے لیا جائے۔ اس جائزے کی روشنی ہی میں مستقبل کے چیلنجوں کا صحیح تعین ہو سکتا ہے اور ان کے مقابلے کے لیے صحیح حکمت عملی کے خدوخال تجویز کیے جاسکتے ہیں۔

اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا ہے کہ وہ سازش جو پاکستان کو قابو میں کرنے اور مسئلہ کشمیر کو تحلیل کرنے کے لیے کی گئی تھی وہ ناکام و نامراد ہوئی۔ جنگ کے جو بادل افق پر چھا گئے تھے' چھٹ گئے۔ بھارت کی معلوم جوہری صلاحیت کے مقابلے میں' پاکستان کی جوہری صلاحیت بھی الم نشرح ہو گئی۔ اسٹرے ٹیجک ابہام کی جگہ اعلان شدہ جوہری صلاحیت نے اس توازن کو نہ صرف بحال کیا جو پہلے قائم تھا بلکہ پاکستان کی اضافی پوزیشن کو کچھ بہتر ہی کر دیا۔ پاکستان نے مختلف نوعیت کے کامیاب تجربات کر کے بھارت کو یہ پیغام دے دیا' کہ اس کے متعین فوجی ہدف بھی ہماری زد میں ہیں اور اگر اس نے جنگ کو پھیلانے کی حماقت کی تو اس کے بیشتر علاقے ہمارا نشانہ بن سکتے ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ایٹمی اسلحہ کا اصل کردار سدجارحیت ہے۔ ان کا استعمال انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے لیکن اس دنیا میں جہاں جنگی جنون اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے' ان کا حصول اپنی حفاظت اور دوسرے کو جنگ سے روکنے کا موثر ترین ذریعہ اور قوت کا وہ اظہار ہے جو سدجارحیت کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے اسلحے کی کسی دوڑ کی ضرورت نہیں اور نہ اسلحے میں مساوات ضروری ہے۔ اصل چیز اتنی قوت کی موجودگی اور اس کے استعمال کی صلاحیت ہے جو دشمن کو پیش قدمی سے روک سکے۔ ۱۱ اور ۱۳ مئی کے بعد بھارت کے وزیراعظم اور وزیر داخلہ نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اب اس علاقے میں طاقت کے توازن میں تبدیلی رونما ہو گئی ہے اور ہم پاکستان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن ۲۸ اور ۳۰ مئی کے بعد ع

آئینہ دیکھ' اپنا سا منہ لے کر رہ گئے!

اور جو کشمیر پر بات کرنے کے خیال کو بھی پاپ قرار دے رہے تھے' دو طرفہ گفتگو کی بات کرنے لگے بلکہ وزیراعظم اور وزیر دفاع دونوں ہی اب یہ تک کہنے لگے کہ "خطرہ کہاں تھا؟" گویا یہ سارا ڈراما دل بہلانے کے لیے کیا گیا تھا۔ بھارت کے لہجے میں جو تبدیلی آئی ہے یہ صرف ۲۸ مئی کا اثر (fall out) ہے اور صرف اس کی روشنی ہی میں بھارت کے رویے میں تبدیلی کو سمجھا جا سکتا ہے' ورنہ :۔

وہی ہم ہیں، وہی تم ہو، نہ ہم بدلے نہ تم بدلے
یہ آخر بات کیا ہے آج اتنے مہرباں کیوں ہو؟

مغربی دانش ور کیا کہتے ہیں؟ بات صرف فوری خطرے کے ٹلنے ہی کی نہیں، بلکہ حال اور مستقبل کے لیے پورے علاقے میں امن کے قیام، اسے جنگ کے شعلوں سے بچانے اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی دیوانگی سے محفوظ رکھنے کے لیے طاقت کے توازن کی بحالی، اس کا اصل حاصل ہے۔ امریکہ اور مغربی اقوام کی دو رنگی اور منافقت کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔ جس سد جارحیت نے عالمی طاقتوں کو پچاس سال سے جنگ سے روکا اور آج بھی روکے ہوئے ہے اور جس کی وجہ سے دنیا کا بڑا حصہ تباہی سے بچا، جنوبی ایشیا کے لیے اس کا حصول ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے اور محض اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے وہ علاقے کو جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنے والے انتظام پر چیں بہ جبیں ہیں۔ پانچ بڑے ہی نہیں آٹھوں ترقی یافتہ ممالک، (چین کے جزوی استثنا کے ساتھ) شعلہ فشاں ہیں، لیکن اس سارے پروپیگنڈے اور شور شرابے کے باوجود عالمی رائے عامہ کا ایک قابل ذکر حصہ ان کے دوغلے پن (hypocrisy) کا اعتراف کر رہا ہے اور ہمارے اس حق کو بادل ناخواستہ ہی سہی، تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اہل پاکستان کے سامنے اس پہلو کو ذرا وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے جبکہ مغربی اور بھارتی لابی کے قلم کار، خصوصیت سے انگریزی اخبارات کے مقالہ نگار تصویر کا بالکل دوسرا اور مغالطہ آمیز رخ پیش کر رہے ہیں۔

پروفیسر لارنس فریڈمین جو کنگز کالج لندن میں وار اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں، وہ پاکستانی دھماکے کے بعد لکھتے ہیں:

> بھارت اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی وسیع پیمانے پر سخت مذمت کی جا رہی ہے لیکن جب یہ معروف ایٹمی طاقتوں کی طرف سے ہو تو ناگزیر طور پر دوغلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اگر وہ ایٹمی اسلحے کو اپنی سلامتی کے لیے قدر و قیمت کا حامل سمجھتے ہیں، تو دوسرے بھی اس نتیجے تک کیوں نہ پہنچیں۔ اگر سد جارحیت کی وجہ سے سرد جنگ کے دوران منقسم یورپ میں امن قائم رکھا جاسکا، کیا وہ یہی کردار دوسرے منقسم علاقوں میں، مثلاً جنوبی ایشیا یا شرق اوسط میں انجام نہیں دے سکتا۔ اس قسم کا استدلال کہ ایٹمی طاقتوں نے مطلوبہ احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے، اس اسلحے کو رکھنے کا حق حاصل کر لیا ہے، نئے آنے والوں کو برگشتہ کرتا ہے اور ان کا یہ یقین مضبوط کرتا ہے کہ یہ سب دنیا میں حیثیت و مرتبہ اور بین الاقوامی اجارہ داری سے متعلق معاملہ ہے۔ (دی ٹائمز، ۲۹ مئی ۱۹۹۸)

انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون میں رچرڈ ریوز نے تحریر کیا ہے:

امریکہ کو، جس نے ایک ہزار سے زائد ایٹمی دھماکے کیے ہیں، بھارت اور پاکستان کے زیر زمین دھماکوں سے "صدمہ" ہوا ہے۔ ہم امریکی اپنی رہنمائی کے حوالے سے حد درجہ منافقانہ اور واہیات باتیں علی الاعلان کہتے ہیں ۔۔۔۔ ہم اپنے آپ کو بڑا خوب صورت دھوکا دیتے ہیں اور دنیا کو ایک ایسا عالمی قبیلہ دیکھنا چاہتے ہیں، جو امریکہ کی دی ہوئی جمہوریت کے ثمرات کے لیے بے تاب ہو۔ ہم اور دوسری تسلیم شدہ جوہری طاقتیں، عدم پھیلاؤ کی وکالت کرتے ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ میں جوہری اسلحے کو تلف کرنے کے خلاف ووٹ دیتے ہیں۔ ہماری پالیسی احمقانہ نہیں ہے، اگرچہ دوغلے پن اور دھوکے سے ضرور عبارت ہے۔ اصل احمقانہ بات تو اس پر واقعی یقین کر لینا ہے کہ بھارت، پاکستان، چین، ایران اور اسرائیل، امریکی تصورات کے مطابق عمل کریں گے اور اپنے قومی مفادات اور اندیشوں کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے۔ (انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون، ۴ جون ۱۹۹۸، ص ۸)

ڈیوڈ پرائس جونز لکھتا ہے:

دنیا کی اعلان شدہ جوہری طاقتوں نے پہلے بھارت اور اب پاکستان کی ایٹمی دھماکا کرنے پر متفقہ طور پر مذمت کی ہے۔ کشمیر کے مسئلے کو ایک آخری مکمل تباہی کے ذریعے حل کرنے کا خطرہ اب حقیقی ہو گیا ہے۔ فوری طور پر توجہ کے قابل یہ امر ہے کہ اس کے نتیجے میں ہر طرف دوغلا پن ہے اور دہری گفتگو ہو رہی ہے۔ فرانس کی وزارت خارجہ کے ایک بیان کے مطابق، فرانس کو افسوس ہے کہ پاکستان نے تحمل سے کام لینے کی اپیلوں کو نہیں مانا۔ زمانہ امن کے کم ہی واقعات پر اتنا شور و غوغا ہوا ہو گا جتنا ۱۹۹۵ میں بحرالکاہل میں فرانس کے جوہری اسلحہ کے تجربے پر ہوا۔ دونوں طرف تباہی کا یقین ہو تو یہ تحفظ کے لیے کسی بھی انسانی منطق کے برابر طاقت رکھتا ہے، خواہ بالکل فول پروف نہ ہو۔ (ڈیلی ٹیلی گراف، ۳۰ مئی ۱۹۹۸، ص ۳۴)

لندن ٹائمز کے کالم نگار اور سابق مدیر ولیم ریس موگ اپنے ہفتہ وار کالم میں اعتراف کیا ہے کہ:

جوہری اسلحہ نہایت طاقت ور سد جارحیت ثابت ہوا ہے۔ برعظیم پاک و ہند میں بھی ایسا ہی ہونے کی توقع ہے جیسا کہ سرد جنگ میں ہوا۔ اگر دونوں سد جارحیت سے توازن میں ایک دفعہ بندھ جائیں، تو بہت کم امکان ہے کہ بھارت یا پاکستان اس بندھن کو توڑیں۔ کیا کوئی حکومت تخفیف اسلحہ کا اندیشہ مول لے سکتی ہے جبکہ دہشت کے توازن کو استحکام حاصل ہو چکا ہو۔ (دی ٹائمز، لندن، یکم جون ۱۹۹۸)

مغربی دنیا کے تجربے کے بارے میں اسی مضمون میں ولیم ریس کے خیال میں:

مغرب میں ہم نے بم کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھ لیا ہے۔ دہشت کے توازن نے سرد جنگ کے دوران کسی بھی فریق کو تیسری جنگ شروع کرنے سے باز رکھا۔ اگر بم نہ ہوتا تو شاید ہم سب مر چکے ہوتے۔

ڈیلی ٹیلی گراف کے مضمون نگار رابن ہیرس کہتا ہے:

ان تجربات نے باقی دنیا کے لیے ایک خدمت انجام دی ہے اور وہ ہمیں ایک بار پھر یہ احساس دلا رہا ہے کہ توازن قوت آج بھی اہم اور موثر ہے اور قوت کے معنی بالآخر فوجی قوت ہی ہیں--- بھارت سرد جنگ سے ہر حال میں ایک مشکل لیکن درست سبق سیکھ سکتا ہے۔ اگر مغرب اس دعوے میں سنجیدہ ہے (جیسا کہ کہتا ہے) کہ اس موقع پر جوہری اسلحہ کی موجودگی ہی نے یورپ کو جنگ سے بچایا کیونکہ روایتی جنگ کا جوہری مقابلے میں تبدیل ہونے کا امکان ہی ناقابل تصور تھا تو یہی بات اب ایشیا کے لیے درست کیوں نہیں؟ یہ علم کہ ہر فریق جوہری حملے کی صلاحیت رکھتا ہے، بھارت یا چین اور پاکستان کے درمیان کسی مزید روایتی جنگ کا امکان ختم کر دیتا ہے۔ (دی ڈیلی ٹیلی گراف، ۹ جون ۱۹۹۸)

امریکی ہفت روزہ نیوز ویک میں اولیور مورٹن کے نزدیک:

گذشتہ نصف صدی سے جوہری اسلحہ صرف علامت اور دھمکی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ایسی جنگیں نہیں ہوئی ہیں جن میں یہ اسلحہ استعمال ہوا ہو۔ صرف ایک دفعہ اسے استعمال کیا گیا، وہ بھی ایک ایسے ملک کے خلاف جس کے پاس یہ اسلحہ نہ تھا۔ جب یورپ کے امن کے ۵۰ سال اور بڑی طاقتوں کے حملہ نہ کرنے میں (stand off) سدجارحیت نے کردار ادا کیا ہے۔ تو پھر دوسرے علاقوں میں یہ صلاحیت یہی کردار کیوں نہ ادا کرے؟ بین الاقوامی تعلقات کے ایسے ماہرین ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے اور یہ کہ پھیلاؤ کی بیشتر مخالفت نسل پرستی کی وجہ سے ہے جو نسلی منافرت سے مختلف نہیں۔ (نیوز ویک، ۲۵ مئی ۱۹۹۸)

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون کا ایک اور مقالہ نگار فلپ بورنگ لکھتا ہے:

ان سے برعظیم میں جوہری توازن بحال ہو گیا ہے۔ بھارت اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کی صلاحیت سے برسوں سے واقف تھے۔ اب جبکہ دونوں کھل کر سامنے آ چکے ہیں، وہ پہلے کی صورت حال کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ یہ مثالی صورت حال تو نہیں لیکن اس کا امکان بہت کم ہے کہ اس سے جوہری جنگ شروع ہو جائے۔ (دی انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون، ۲۹ مئی ۱۹۹۸)

ڈیلی ٹیلی گراف کے دفاعی نامہ نگار ٹم بوچر نے فوجی ماہرین کی آرا کی بنیاد پر لکھا کہ:

کل کے تجربات سے بعض عسکری اہل فکر کو یہ اطمینان حاصل ہوا ہے کہ پاکستان نے جوہری بم دھماکا کرنے کی صلاحیت کا اظہار کر کے بھارت کے لیے یہ منطق باقی نہیں رہنے دی ہے کہ وہ پاکستان پر پہلے ہی حملہ کر دے تاکہ پاکستان یہ ٹکنالوجی حاصل نہ کر سکے۔ (دی ڈیلی ٹیلی گراف' ۲۹ مئی' ۱۹۹۸)

ہم صرف چند اہم ماہرین اور کالم نگاروں کے خیالات پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ اس سلسلے میں موجود مواد تو انبار لگانے کے لیے کافی ہے۔ پاکستان اگر بھارت کے دھماکوں کے بعد یہ اقدام نہ کرتا تو وہ مہلک ہوتا۔ اب نہ صرف یہ کہ ایک نیا توازن قوت قائم ہو گیا ہے بلکہ اس کے دور رس اثرات پورے علاقے اور عالمی سطح پر رونما ہوں گے اور خود امریکہ اور دونوں بڑی طاقتوں کی اجارہ داری کے لیے چیلنج رونما ہو گا۔ ماضی کی حکمت عملی اب ناکارہ ہو رہی ہے۔ عالمی یا علاقائی بالادستی کے تصورات شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکیں گے۔ اور اس کے جلو میں آیندہ صدی میں بنیادی تبدیلیوں کے دور رس عمل کے آغاز کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ معروف مضمون نگار جم ہاگینڈ' جس کے مضامین ہیرالڈ ٹریبیون میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں' لکھتا ہے:

بھارت اور پاکستان نے ایک دوسرے کے مقابلے پر جوہری تجربات کر کے عالمی عزائم اور طاقت کے نقشوں کی از سر نو تشکیل کر دی ہے۔ ان کے نافرمانی اور گستاخی سے کیے جانے والے (defiant) دھماکوں نے عالمی امور میں امریکی قیادت کی نوعیت اور ضرورت کے بارے میں شبہات پیدا کر دیے ہیں' جب کہ چند سال قبل ہی امریکہ ایک ایسا عالمی عفریت بنا جا رہا تھا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں۔ پیرس' ماسکو اور دوسرے یورپی شہروں میں گذشتہ چند ہفتوں میں سینئر اہل کاروں کی گفتگوؤں سے پتا چلتا ہے کہ خلیجی جنگ کے دوران امریکی طاقت کا جو بھرپور مظاہرہ ہوا تھا اس کے اثرات اب تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ (واشنگٹن پوسٹ' ۴ جون ۱۹۹۸)

مسئلہ کشمیر کا حل' وقت کی آواز

بھارت پر اس کا جو اثر ہوا ہے اس کا مشاہدہ اور مطالعہ بھارت کی پارلیمنٹ میں پاکستان کے دھماکے کی خبر کے بعد دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ لندن کے روزنامہ ٹائمز کا نمایندہ کرسٹوفر تھامس' دہلی سے اپنے مکتوب میں اسے موقف میں تبدیلی اور مذاکرات پر آمادگی قرار دیتا ہے:

بھارت نے پاکستان کے ساتھ تعاون کا مستحکم ڈھانچا تشکیل دینے کی اور امن کی تلاش میں تازہ مذاکرات شروع کرنے کی پیش کش کی ہے۔ بھارت نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ راستہ بدلنے کا وقت ہے' کم سے کم عوامی بیانات میں۔ واجپائی نے دونوں ملکوں میں جلد از جلد براہ راست مذاکرات

بحال کرنے کی بات کی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ کشمیر کو ایجنڈے سے باہر رکھنے کے لیے نہیں کہا ہے۔ (دی ٹائمز' ۱۰ جون' ۱۹۹۸)

ہمیں بھارت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں اور دو طرفہ مذاکرات کا پچاس سالہ تجربہ گواہ ہے کہ یہ ہمیشہ لاحاصل رہے ہیں۔ پاکستان کے لیے واحد راستہ بین الاقوامی شراکت اور کشمیری عوام کے نمایندوں یعنی آل پارٹیز حریت کانفرنس کی قیادت کی شمولیت میں ہے۔ بھارت سے مذاکرات اس وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ کشمیر کے ناجائز قبضے کو اتنا مہنگا بنا دیا جائے کہ بھارت کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ لیکن ۱۱ مئی کے بعد جو تیور بھارت کی قیادت دکھا رہی تھی اس کے مقابلے میں اب مذاکرات کی پیش کش ۲۸ اور ۳۰ مئی کے واقعات کی ابتدائی رسید ہے اور اگر پاکستان کی قیادت نے صحیح حکمت عملی اور مضبوط موقف اختیار کیا تو آگے کے مراحل بھی طے کیے جانے کا امکان ہے۔ ابھی تو صرف اتنا ہوا ہے کہ۔

تجاہل' تغافل' تبسم' تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

کشمیر' عالمی مسئلہ : پاکستان کے جوہری دھماکوں کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو عالمی سطح پر ایک ایسا مسئلہ سمجھا جانے لگا ہے جس کا حل ضروری ہے --- اور جس کے حل نہ ہونے کے علاقائی ہی نہیں' عالمی امن پر بھی بڑے مہلک اثرات مرتب ہو سکتے ہیں' یہ ایک تاریخی موقع ہے جس سے پاکستان کو بھرپور سفارتی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مسئلے کو عالم گیر بنانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ یہی چیز بھارت پر مناسب دباؤ کا ذریعہ بنے گی۔ اندرونی تحریک مزاحمت کی تقویت اور اثر انگیزی کے بعد جی ایٹ' پی فائیو سلامتی کونسل' اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل' امریکہ' برطانیہ' چین' فرانس' جاپان اور دوسرے ممالک کی قیادت اور عالمی پریس اور میڈیا نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور کہیں کھل کر اور کہیں دبے لفظوں میں اس کے حل کی ضرورت کا اعتراف کیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں چند حوالے پیش کرتے ہیں:

اکانومسٹ لندن اپنے خصوصی مقالے میں اعتراف کرتا ہے کہ:

آخری بات یہ ہے کہ علاقائی تنازعات کی بنیادوں تک جانا ہی ہولناک تباہی کے خطرے سے بچنے کا یقینی راستہ ہے۔ (اکانومسٹ' ۶ جون ۹۸' ص ۲۵)

اسی شمارے کے اداریے میں اکانومسٹ لکھتا ہے:

کشمیر کے سلگتے مسئلے میں مدد دینے کے لیے نئی کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ (اکانومسٹ' ص ۱۷)

ٹائمز لندن اپنے ۲۹ جون کے اداریے The Pakistan fallout میں جی ایٹ کو مخاطب کر کے لکھتا

ہے:

ایٹمی علاقے کا دورہ کرنے کے لیے کسی سیاسی مذاکرات کار کا تقرر کر دینا چاہیے۔ کینیڈا ایک دولت مشترکہ کا ساتھی ملک ہے اور تخفیف اسلحہ کا پرجوش علم بردار ہے۔ کسی سینئر کینیڈین کو دہلی اور اسلام آباد جانا چاہیے اور گرم فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پہلا قدم بشمول کشمیر پر گفتگو اٹھانا چاہیے۔ کسی نئی جنگ کے اندیشے کو روکنے کے لیے غم و غصے کا اظہار کافی نہیں ہے۔ (دی ٹائمز' ۲۹ مئی ۱۹۹۸)

اکانومسٹ نے اپنی ۱۳ جون کی اشاعت میں مظفر آباد کے نامہ نگار کی رپورٹ شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

ایٹمی تجربات کے بعد' کشمیر نے زیادہ بین الاقوامی توجہ حاصل کر لی ہے۔ کشمیر کا تصفیہ' پاکستان اور بھارت کو امن کے راستے پر آگے بڑھانے کا اور علاقے میں تکالیف' مصائب کم کرنے کا واحد راستہ ہے۔ (اکانومسٹ' ۱۳ جون ۹۸' ص ۷۶)

جیفری اسمتھ کشمیر کے بارے میں خفیہ رپورٹوں کی بنیاد پر لکھتا ہے کہ:

اب ہم حالات و کیفیات کے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف ماحول میں کام کر رہے ہیں جس میں ہم تین ہفتے قبل کر رہے تھے۔ جنگ کی موجودہ صورت میں' پاکستانی' صلاحیت کے لحاظ سے بھارت سے اس سے زیادہ قریب ہیں جتنا کہ ان میں سے کوئی سمجھتا ہے۔ (دی انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون' ۶-۷ جون ۹۸' ص ۷۰)

واشنگٹن پوسٹ اپنے اداریے میں کشمیر کے مسئلے کی بنیادی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے اور پانچ مستقل ممبروں کو متوجہ کرتا ہے کہ:

پانچوں ممالک کو تنازعہ کشمیر کے سلگتے مسئلے پر فوری توجہ دینا چاہیے' جو دنیا کے پہلے جوہری تبادلے کا امکانی مقام ہے۔ (انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون' ۳ مئی' ۹۸)

خود بھارت کے اخبارات اور کالم نگار اب کشمیر کے مسئلے کے عالمی افق پر اہمیت اختیار کر جانے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ دی ایشین ایج (دہلی و لندن) اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

بھارت کے محکمہ خارجہ نے اگرچہ یہ منصوبہ نہ بنایا ہو' لیکن ایٹمی دھماکے کا ایک براہ راست نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کشمیر کا مسئلہ پھر سے سامنے آگیا ہے۔ (دی ایشین ایج' ۶ جون ۹۸)

اسی روزنامے کی کالم نگار سیما مصطفیٰ لکھتی ہے:

کشمیر اب بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ کشمیر اب جوہری ایجنڈے کا غیر متنازعہ حصہ ہے۔

نیویارک ٹائمز میں رابرٹ میک فارلین جو صدر ریگن کا سیکورٹی ایڈوائزر تھا، امریکہ کی قیادت کو متوجہ کرتا ہے کہ:

اسے سب سے پہلے جنوبی ایشیا کی سلامتی کی نازک صورت حال کے سنجیدہ تجزیے اور موجودہ کش مکش کے سب سے آتش فشاں مسئلے، یعنی تنازع کشمیر پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

اسی طرح رانڈ کارپوریشن کا سینئر ایڈوائزر رابرٹ ہنٹر اس امر پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ ان جوہری دھماکوں کے نتیجے میں بیرونی دنیا علاقائی مسائل اور تصادم کے حالات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوئی ہے۔ لیکن وہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا دنیا کی بڑی طاقتیں موثر ردعمل فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں؟ مسائل کی نشان دہی کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

علاقائی سلامتی کا نظام قائم کرنے کے لیے ابتدائی اقدامات کرنے چاہییں۔ کشمیر، امریکہ اور دوسری بڑی طاقتوں کی ثالثی کا اہم نکتہ ہونا چاہیے۔ (لاس اینجلز ٹائمز، ۵ جون ۹۸)

ڈیلی ٹیلی گراف کا وقائع نامہ نگار ڈیوڈ پرائس جونس لکھتا ہے:

صاف نظر آ رہا ہے کہ شرق اوسط اور برعظیم پاک و ہند کے پرانے علاقائی تنازعے، عالمی اہمیت کے حامل زندگی اور موت کے نازک مسئلے بننے والے ہیں جن کے اثرات ان علاقوں سے دور دور تک ہوں گے۔ (دی ڈیلی ٹیلی گراف مئی ۱۹۹۸)

عالمی آرا کے اس جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جوہری دھماکے کا ایک دور رس اہمیت کا حامل نتیجہ کشمیر کے مسئلے کا عالمی سطح پر شعور اور اس کے حل میں دلچسپی کا رونما ہونا ہے۔ یہ ایک تاریخی موقع ہے جسے تغافل یا نااہلی سے ضائع کر دینا ناقابل معافی جرم ہو گا۔ ضروری ہے کہ پاکستان اپنی بہترین صلاحیت سے کشمیر کے مسئلے کو دنیا کے سامنے لائے اور اس کے حل کی کوششوں میں کسی قسم کی سستی اور انقطاع نہ آنے پائے۔ نیز یہ کام، جیسا کہ ہم نے بار بار واضح کیا ہے، صرف موثر اور مسلسل سفارتی مساعی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ تحریک مزاحمت کی تقویت اور پشت پناہی اس کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ کشمیر کے عوام بھارت کے ظلم کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ ہمیں ان کے حق خود ارادیت کی حمایت اور اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ انگیز کرنے میں بھی باک نہیں ہونا چاہیے۔

جوہری دھماکے، بحث کا موضوع

ان اہم اور دور رس اثرات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بنیادی نتیجہ ان جوہری دھماکوں کا یہ بھی ہوا ہے کہ ایک بار پھر جوہری مہلک ہتھیاروں سے دنیا کو پاک کرنے کا مرکزی موضوع زندہ ہو گیا ہے۔ امریکہ اور مغربی

اقوام کی اصل دلچسپی جوہری ہتھیاروں سے نجات اور دنیا کو پاک کرنا نہیں بلکہ ان کے ذریعے اپنی بالادستی کو قائم رکھنا اور توازن قوت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرنا ہے۔ این پی ٹی' سی ٹی بی ٹی' جوہری مادہ کی افزودگی پر روک' اور میزائل نظام کے فروغ پر قدغن کے معاہدے سب اس عالمی کھیل کا حصہ ہیں۔ پانچ بڑوں کی بالاتر حیثیت کو ایک مدت کے بعد مئی کے دھماکوں کی شکل میں چیلنج کیا گیا ہے اور اب عالمی ایوانوں اور رسائل و اخبارات کے کالموں میں یہ بحث دوبارہ تازہ ہو گئی ہے کہ جوہری ہتھیاروں کو تلف کرنے (elimination) پر توجہ مرکوز کی جائے اور اس سے فرار کا جو راستہ بڑی طاقتوں نے اختیار کیا تھا' اس سلسلے میں ان پر نیا دباؤ ڈالا جائے۔

صدر کلنٹن پاکستان کے دھماکے پر تو نوحہ کرتے ہیں کہ جنوبی ایشیا اکیسویں صدی میں جوہری بموں کا پشتارہ اپنے کاندھوں پر لاد کر داخل ہونے کی حماقت کر رہا ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ خود امریکہ آٹھ ہزار بم اور اتنے ہی جوہری اسلحے کا پہاڑ اپنے سر پر سجائے اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ پھر یہ اصرار کر رہا ہے کہ صرف نیوکلیر لڑائی ہی نہیں عام ہتھیاروں کی جنگ میں بھی جوہری ہتھیار استعمال کرنے کا اس کا حق محفوظ ہے۔ لندن ٹائمز میں مطبوعہ ایک خط میں پروفیسر جوزف روٹ بلاٹ امریکی صدر کے ایک حکم نامہ نمبر ۶۰ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> گذشتہ موسم سرما میں امریکہ کی اعلیٰ فوجی کمان کے سامنے آنے والی دستاویز (PDD-60) سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی حکومت نہ صرف جوہری حملے' بلکہ کسی بھی طرح کے اسلحے سے حملے کے خلاف' ضروری سدجارحیت کے لیے جوہری اسلحہ برقرار رکھنے پر غور کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ جوہری اسلحے کے پہلے استعمال کی اجازت دے گی"۔ (دی ٹائمز' ۲ جون ۱۹۹۸)

پروفیسر روٹ بلاٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ہم دہرے معیار کو برداشت کرتے نہیں چلے جا سکتے۔ جوہری مسئلے کو حل کرنے کا قطعی طریقہ یہ ہے کہ ایک کثیر قومی معاہدے کے تحت تخفیف اسلحہ کے باہمی' متوازن' قابل تصدیق اقدامات کے ذریعے جوہری اسلحہ ختم کر دیا جائے۔

اسی طرح فنانشل ٹائمز کا ایک مکتوب نگار پال والٹر لکھتا ہے:

> کلنٹن کی بھارت اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی مذمت کو کیا وزن دیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے دفتر کے باہر ایک میرین ایک بریف کیس لیے کھڑا ہے جس کے ذریعے اس کرۂ ارض سے کل زندگی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ (فنانشل ٹائمز' خطوط' ۳ جون ۹۸)

یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے کہ دنیا کے سیاسی ایوانوں میں جوہری ہتھیاروں کے وجود اور بڑی

طاقتوں کی اجارہ داری کو چیلنج کیا جانے لگا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخطوں کی لاحاصل اور بے معنی بحث میں الجھنے کے بجائے دنیا کو جوہری ہتھیاروں اور ہلاکت عام کے تمام ہتھیاروں سے پاک کرنے کی مہم چلائی جائے اور پاکستان اور امت مسلمہ اس میں عالم انسانی کی رہنمائی اور قیادت کرے۔ اس طرح ہم ایک ردعمل (reaction) نہیں بلکہ ایک پیش بین (pro-active) پالیسی کے علم بردار بن سکیں گے اور پوری انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے اور عوامی قوت کو ظالم حکمرانوں کے مقابلے میں صف آرا کرنے کا تاریخی کارنامہ انجام دے سکیں گے۔

مسئلہ جوہری عدم پھیلاؤ کا نہیں بلکہ جوہری ہتھیاروں کے مکمل خاتمے (total elimination) کا ہے۔ اور پاکستان کے جوہری دھماکوں نے کم از کم سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو اس اصل مسئلے کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے ضمیر کو جھنجوڑنے کا کام انجام دیا ہے۔

مسلم دنیا میں لہر : پاکستان کے جوہری دھماکے کے کچھ نہایت مثبت اثرات خود ملک میں اور بہ حیثیت مجموعی عالم اسلام میں رونما ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ قوم کے عزم و حوصلہ کو نئی زندگی ملی ہے، خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے، عزت نفس کا احساس گہرا ہوا ہے، اللہ پر بھروسا کرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جذبہ پیدا ہوا ہے، عالمی سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھنے، دوست اور دشمن میں تمیز کرنے اور مدمقابل کے کھیلوں اور چالوں کو سمجھنے کا داعیہ پیدا ہوا ہے۔ اس ایک واقعہ نے قوم میں نہ صرف زندگی کی نئی لہر دوڑائی ہے، بلکہ آپس میں اتحاد اور اتفاق، یکسانی و یک رنگی، اور دوسروں کی محتاجی کے مقابلے میں اپنے اوپر بھروسے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ عزت، اعتماد اور اتحاد وہ چیزیں ہیں جو قوموں کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتی ہیں اور دشمن کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتی ہیں۔ یہ اتنی بڑی کامیابی ہے کہ اسے کوئی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کیفیت صرف پاکستان اور ساری دنیا میں بسنے والے پاکستانیوں ہی کی نہیں، بلکہ کم و بیش دنیا کے تمام مسلمانوں کی ہے۔ ۲۸ مئی کے دھماکے کے بعد میرے پاس دنیا کے گوشے گوشے سے اور ہر علاقے سے مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان آئے جو خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتے تھے اور کہتے تھے کہ آج پاکستان نے ہماری عزت رکھ لی ہے۔ بم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن پاکستان کی جوہری صلاحیت کو پوری امت مسلمہ نے اپنی صلاحیت سمجھا ہے اور بے ساختہ دل اس فرقان الٰہی کی تائید میں رقص کناں ہو جاتا ہے کہ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ بے شک تمھاری یہ امت ایک امت ہے!

اس سلسلے میں معلومات تو بے حساب ہیں لیکن صرف عرب دنیا کے چند اہم اخبارات میں شائع شدہ احساسات کو بطور نمونہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ سعودی عرب کے اخبار الریاض نے ادارتی تبصرے میں

کہا ہے:

یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کی حمایت کریں جو پہلی اسلامی سد جارحیت کی قوت ہو سکتا ہے۔ (بحوالہ فار ایسٹرن اکنامک ریویو' ۲ جون ۱۹۹۸' ص ۲۸)

الشرق الاوسط کا تبصرہ یہ ہے:

بہت سے مسلم ممالک خوشی کی لہر محسوس کریں گے جب کہ امریکہ جیسی فیصلہ ساز طاقتوں کی رگوں میں پاکستان کے ایٹمی کلب میں داخل ہونے سے خون منجمد ہو جائے گا۔ (گارڈین' ۳ جون ۱۹۹۸' ص ۱۹)

القدس العربی پاکستان کے جوہری تجربے کے آئینے میں عرب صورت حال کا جائزہ لیتا ہے:

پاکستان نے' جس کی سربراہی ایک منتخب وزیر اعظم کر رہا ہے' پہلا اسلامی ایٹم بم تیار کر لیا ہے' جب کہ تمام عرب حکومتیں مل کر بھی' جن میں وہ بھی ہیں جن پر فوجی حکومت کر رہے ہیں' ایک ٹینک بھی نہیں بنا سکے ہیں ---- عرب ممالک کے پاس جوہری اسلحہ بنانے کے لیے وسائل بھی ہیں اور ضرورت اور جواز بھی۔ (حوالہ مذکورہ بالا)

لندن کا الحیات پاکستان کے تجربے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

پاکستان ساتویں ایٹمی طاقت ہے' اور اسلامی دنیا کی پہلی ایٹمی طاقت۔

امارات کا اخبار الخلیج پاکستان کی کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اس علاقے میں صرف اسرائیل کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے' جبکہ مقابلے میں عرب جوہری سد جارحیت حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ (بحوالہ دی ڈیلی ٹیلی گراف' ۳۰ مئی ۹۸)

دی گارڈین کا شرق اوسط کا نامہ نگار ڈیوڈ ہرسٹ لکھتا ہے:

"پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں نے راتوں رات شرق اوسط کو زیادہ خطرناک علاقہ بنا دیا ہے۔ یہ خطرات پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر عرب اسرائیل معاہدہ امن بے نتیجہ جاری رہتا ہے تو خطرے کی حد پار کر لی جائے گی اور ہلاکت عام کا اسلحہ علاقے میں آ جائے گا۔ "عرب بم" بنانے کے لیے نئی اپیلیں کی جا رہی ہیں تاکہ ایٹمی اسلحے پر اسرائیل کی طویل المدت غیر اعلان شدہ اجارہ داری ختم کی جا سکے۔ (دی گارڈین' ۳ جون ۹۸' ص ۱۵)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح پاکستان کے جوہری تجربے نے پوری امت مسلمہ کو بیدار کر دیا ہے اور اسے درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے نیا حوصلہ دیا ہے۔

پاک چین دوستی' نیا دور: ایک اور قابل ذکر پہلو پاکستان اور چین کی تاریخی دوستی کا مزید مستحکم

ہو جاتا ہے۔

اول: بھارتی وزیر اعظم نے ۱۱ مئی کے دھماکے کے بعد دنیا کے اہم ملکوں کے سربراہوں کو ایک خط بھیجا' دوم: وزیر دفاع نے اپنے متعدد بیانات میں چین کے خلاف جنگی جنون کا مظاہرہ کیا' سوم: وزیر اعظم کے مشیر نے دہلی میں تمام اہم سفیروں کو ایک بریفنگ دی لیکن پاکستان اور چین کے سفیروں کو اس میں مدعو نہیں کیا' ان حالات میں چین اس خطرناک کھیل کا مزید قائل ہو گیا جو بھارت اس علاقے میں کھیل رہا ہے۔ اس سے پاکستان اور چین دونوں کے ہاں مشترک مفادات کے تحفظ اور مشترک خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترک مساعی کی ضرورت کا احساس اور بڑھ گیا۔

چین کے سرکاری ترجمان' چائنا ڈیلی نے اپنی حالیہ اشاعت (۱۱ جون ۹۸) میں امریکہ کو اس کے دہرے معیار پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

۸ ہزار جوہری بموں سے مسلح امریکہ کو اپنی جوہری حکمت عملی کو ترتیب نو دینے اور تخفیف اسلحہ کو آگے بڑھانے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنا چاہیے۔ امریکہ کی جوہری پالیسی بددیانتی پر مبنی ہے۔ اس پر نظرثانی کرنا چاہیے۔ یہ پالیسی جوہری اسلحے کے پھیلاؤ کو ایک ناگزیر رجحان بنا رہی ہے۔ پاکستان ایٹمی تجربات کرنے والا آخری ملک نہیں ہوگا۔ جب امریکہ دوسرے ملکوں کو جوہری اسلحے کی دھمکی دے گا تو یہ دوسرے ممالک لازماً اپنے دفاع کے لیے جوہری پروگرام پر عمل کریں گے۔ (بحوالہ دی ایشین ایج' لندن' ۲۰-۲۱ جون ۹۸)

امریکہ اور بھارت دونوں کی جارحانہ اور امتیازی پالیسیوں نے چین اور پاکستان اور پاکستان اور عرب اور مسلم ممالک کو ایک دوسرے سے اور بھی قریب کر دیا ہے۔ ہمارے جوہری تجربے نے ایک طرف دوستوں میں قربت پیدا کی ہے تو دوسری طرف دوستی کے پردے میں دھونس جمانے والوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ایسے ہی دوستوں کے بارے میں سچ کہا کہ

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے' دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

درپیش چیلنج

جوہری تجربے کے کچھ مزید قابل غور چیلنج رونما ہوئے ہیں۔ ان میں پانچ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

اول: امریکہ اور مغربی اقوام سے تعلقات میں کشیدگی کا رونما ہونا۔ دوم: برصغیر میں اسلحے کی دوڑ کا خطرہ' سوم: وہ معاشی اور عسکری پابندیاں جو امریکہ' جاپان اور چند دوسرے ممالک پاکستان پر لگا رہے ہیں' اور ان

کے "تباہ کن" اثرات کے خدشات، چہارم: پاکستان کی غربت، تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی کمی اور یہ رونا کہ غریب ملک کے لیے جوہری ہتھیار ایک "مجرمانہ عیاشی" ہیں۔ اور پنجم: یہ دینی اور اخلاقی اضطراب کہ جوہری بم کی طرح کے ہلاکت عام کے ہتھیار (weapon of mass destruction) اسلام کے اصول جنگ اور جرم و سزا سے متصادم ہیں اور ان سے نکلنے والے تابکاری اثرات انسان اور زمین دونوں کے لیے نقصان دہ اور اپنے ماحولیاتی اثرات کے اعتبار سے تباہ کن ہیں۔

امریکہ اور مغرب سے تعلقات: جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، جہاں دنیا کے تمام ممالک سے دوستی اور تعاون کو ہماری خارجہ سیاست کی بنیاد ہونا چاہیے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ دوست اور غیر دوست میں تمیز کی جائے، وقت پر کام آنے والے اور وقت پر پیٹھ دکھا دینے والے اور پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے کی پہچان ہو۔ ملک و ملت کے حقیقی مفادات کی روشنی میں دوست اور دشمن بنانا آزادی، قومی سلامتی اور عزت کے تحفظ کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ہم بھی امریکہ سے دوستی چاہتے ہیں لیکن امریکہ سے دوستی کی پچاس سالہ تاریخ (track record) کی روشنی میں ان حدوں کا تعین ہونا چاہیے جن کی بنیاد پر تعاون اور اعتبار کیا جائے۔ عالمی سیاست میں دوسرے کے مفاد کے لحاظ کے ساتھ اپنے حقیقی مفاد کا تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ نیز موقع اور وقت کے لحاظ سے علاقائی صورت حال کی روشنی میں قوت معاملہ و مجادلہ (bargaining power) سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

صدر ایوب خان نے ۱۹۶۳ میں ایک تاریخی موقع گنوا دیا۔ جنرل ضیا الحق نے روس کے افغانستان میں اقدام سے پوری ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا اور پاکستان جوہری پروگرام کو ساری مخالفت کے باوجود اس مقام تک لے آئے جہاں مدمقابل کے لیے حقائق کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ گو پہلا موقع پاتے ہی صدر بش نے سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے صاف انکار کر دیا اور تاریخی دوستی کا کوئی پاس نہ کیا۔ بڑی طاقتوں سے تعلقات باہمی مفادات کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور وقت کے نشیب و فراز ان کے بارے میں بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ ماضی میں ہم نے صحیح وقت پر اپنی حیثیت سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا اور اس کی سزا بھگتی۔

پاکستان کوئی کمزور اور غیر اہم ملک نہیں ہے۔ اس کی ایک اسٹرے ٹیجک اہمیت ہے۔ چودہ کروڑ کا یہ ملک جغرافیائی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے وسط ایشیا کے لیے سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے افرادی اور مادی وسائل ---- اس کی اسٹرے ٹیجک حیثیت کو مزید مضبوط کرتے ہیں۔ خالص معاشی پہلو سے بھی یہ ایک اہم مارکیٹ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات میں جتنی ضرورت ہمیں امریکہ اور مغربی اقوام سے دوستی کی ہے اتنی ہی ان کو ہماری بھی ضرورت ہے۔ اس لیے دوستی سے محرومی کا ہوا، غیر حقیقی ہے۔ بلکہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے تاکہ تعلقات محتاجی (dependance) اور

طفیلی حیثیت (client states) کی بنیاد پر نہیں بلکہ مفاد باہمی اور سیاسی دوستی کی بنیاد پر ہو سکیں جن میں دونوں اپنے مفاد کے مطابق حصہ پا سکیں۔ جن معاملات میں ہمارا قومی مفاد یا امت مسلمہ کا مجموعی مفاد ان کے مفاد سے متصادم ہو، وہاں ہم لکم دینکم ولی دین (تم اپنے طریقے پر اور ہم اپنے طریقے پر) کہہ سکیں۔

درحقیقت جوہری صلاحیت کا اظہار ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کون ہمارا حقیقی دوست ہے اور کس کی دوستی ناقابل اعتماد ہے۔ امریکہ کے مقابلے میں چین، ایران، سعودی عرب، ملائشیا، امارات، بنگلہ دیش اور حتیٰ کہ جاپان اور کوریا نے اپنی اپنی مشکلات کے باوجود جس طرح اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ اپنے اندر ہمارے لیے روشنی اور عبرت کے بہت سے سبق رکھتا ہے اور اس طرح خود بھارت کے سلسلے میں امریکہ اور روس نے جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر ابھی تک کسی کی آنکھیں نہ کھلی ہوں تو!

اسلحے کی دوڑ: دوسرا مسئلہ اسلحے کی دوڑ کا ہے۔ اس بارے میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اسلحے کی دوڑ ہرگز ہمارے مفاد میں نہیں اور ہم لمبے عرصے تک اس کا بار بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس پورے علاقے کے بارے میں بھارت کے عزائم سے کون واقف نہیں، وہ آنکھیں بند کر کے اپنے عزائم کی تکمیل کی جانب بگٹٹ جا رہا ہے اور روس کی طرح اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ ہمارے لیے اس باب میں احتیاط اور تدبر بے حد ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کم سے کم درجے کی موثر سدجارحیت (minimum credible deterrance) ہی اسلحے کی دوڑ کا علاج ہے۔ ہم اپنی آزادی اور قومی سلامتی کا سودا نہیں کر سکتے، لیکن ان کے تحفظ کے لیے کوئی ایسا راستہ بھی اختیار نہیں کر سکتے جو ملک کو دیوالیہ کر دے۔ بیچ کا راستہ یہی ہے کہ حقیقی سدجارحیت کی صلاحیت پیدا کی جائے اور اسے برقرار رکھا جائے۔ اس کے لیے برابری ہرگز ضروری نہیں اور نہ مخالف قوت کے ہر اقدام پر ردعمل ضروری ہے۔ البتہ اتنی صلاحیت کی موجودگی ازبس ضروری ہے جس سے مخالفین جان لیں کہ ان پر کاری ضرب لگانے کی طاقت ہمارے پاس ہے اور مسئلہ صرف پہلے وار ہی کا نہیں بلکہ پہلے وار کے بعد دوسرے وار کا انتظام بھی ہے۔ یہ سدجارحیت کا ایک حرکی (dynamic) تصور ہے، اور اس کے لیے جوہری صلاحیت کا اعلان و اظہار اب ناگزیر ہو گیا تھا۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ روایتی سامان جنگ میں بھارت ہم سے کہیں زیادہ قوت و صلاحیت رکھتا ہے اور اسے مزید بڑھا رہا ہے۔ زمینی مقابلے میں ہماری اور اس کی صلاحیت میں ۲.۵:۱ کی نسبت ہے، ہوائی جنگ کی صلاحیت میں یہ نسبت ۳:۱ اور بحری جنگ کے باب میں ۵:۱ یا اس سے بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ گذشتہ دس سال سے بھارت اپنے دفاعی اخراجات میں سالانہ ۱۰ سے ۱۴ فی صد اضافہ کر رہا ہے اور اس سال یہ مجموعی اضافہ ۱۴ فی صد اور جوہری تحقیق و تیاری کے بجٹ میں ۵۰ فی صد ہے، اس لیے اس

دوڑ میں ہم شریک ہو کر آگے نہیں نکل سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس اتنی جوہری صلاحیت ہو کہ بھارت کی روایتی سازوسامان کی برتری کو غیر موثر بنا دیں۔

پھر یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ بھارت کے پلوٹونیم پر مبنی جوہری پروگرام کے مقابلے میں ہمارا یورنیم افزودگی پر مبنی پروگرام لاگت کے اعتبار سے سستا، فنی اعتبار سے زیادہ بہتر اور قابل اعتماد اور تابکاری اثرات کے اعتبار سے کم نقصان دہ ہے۔ کچھ پروسس (processes) کے سلسلے میں ہم نے کم وقت میں اور کم اخراجات سے وہ نتائج حاصل کر لیے ہیں، جن کے لیے بھارت نے ہم سے تین اور چار گنا زیادہ اخراجات برداشت کیے ہیں۔ اس لیے جہاں ہمارے لیے ضروری ہے کہ مادہ کی افزودگی، تصغیر (minituerization) اور اسلحہ سازی (weaponization) کی وہ سطح حاصل کر لیں جو پہلی اور دوسری ضرب کے لیے ضروری ہیں، وہیں ہمیں تعداد کے بارے میں مساوات اور مسابقت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اور یہ صرف موثر جوہری صلاحیت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

اس کے ساتھ ہی اپنی پوری دفاعی حکمت عملی کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہوائی قوت کو مزید مستحکم کرنے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح بحری قوت کو ایک اسٹرے ٹیجک حد تک لانا ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں بری جنگی صلاحیت کو کار آمد بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ایک مربوط دفاعی نظام وجود میں آ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک جنگ (warfare) کی صلاحیت کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ آج اصل چیز تعداد اور کمیت نہیں، کیفیت اور برق رفتار تیر بہ ہدف دفاعی صلاحیت ہے۔ نیز تربیت، ٹکنالوجی اور مہارت فیصلہ کن قوت بن گئے ہیں۔ بہتر تربیت یافتہ اور مناسب ہتھیاروں سے آراستہ مختصر فوج ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔

اس کے ساتھ عوام کی عسکری تربیت بھی ضروری ہے کیوں کہ تربیت یافتہ عوام وقت پڑنے پر دفاع کی دوسری لائن بن سکتے ہیں۔ اس لیے سامراجی دور میں دفاع کے لیے جو حکمت عملی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے تجربات کی روشنی میں بنائی گئی تھی اور یا جوہری قوت سے قبل کی ٹکنالوجی کے پس منظر میں جو حکمت عملیاں بنائی گئیں ان پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ ہماری نگاہ میں اسلحہ دوڑ کا ہوا' ایک واہمہ ہے اور اس سے شعوری طور پر بچنا ہماری ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ موثر دفاعی نظام کی موجودگی جو جوہری قوت کی مرکزی حیثیت سے مربوط ہو، وقت کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں جوائنٹ چیفس کا ادارہ ایک موثر کردار ادا کر سکتا ہے لیکن اب تک ہم نے اسے اس کے صحیح مقام تک ترقی نہیں دی۔ نیز جوہری ہتھیاروں کے سلسلے میں بھی جن مددگار صلاحیتوں (supportive capabilities) کی ضرورت ہے، ان کی فکر کرنی چاہیے۔ اس میں مادہ کی افزودگی کا دفاعی اور تجارتی بنیادوں پر اہتمام، انٹیلی جنس اور نگرانی (survillance) کا موثر نظام، ترسیلی نظام کی مزید ترقی اور بہتری اور ایک قابل اعتماد نظام تنسیق و تحکیم (command

and control system) قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی درجے میں موجود ہے لیکن ان کی مزید ترقی و تزئین ضروری ہے اور یہی دراصل اسلحے کی دوڑ سے بچنے کا راستہ ہے۔

معاشی اور دفاعی رسد: تیسرا مسئلہ معاشی، ملی اور دفاعی سامان کی رسد پر پابندیوں کا ہے۔ جہاں تک پابندیوں کے لگائے جانے کا سوال ہے، یہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ اگر امریکہ یا کوئی اور ملک اس پر ادھار ہی کھائے بیٹھا ہے تو یہ شوق بھی پورا کر لے۔ ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی آزاد اور باغیرت قوم محض دوسروں کی پابندیوں کے خوف سے اپنی سلامتی اور وجود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ بقول جوش:

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

تاریخ گواہ ہے، پابندیاں کبھی بھی کسی ملک کی راہ کھوٹی نہیں کر سکی ہیں بلکہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ع

بڑھتا ہے ذوق جرم، یہاں ہر سزا کے بعد

۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد ۲۰ سال تک ساری سرمایہ دار دنیا نے روس پر پابندیاں لگائیں مگر کیا حاصل ہوا؟ کیوبا میں ۱۹۶۲ سے پابندیاں لگی ہوئی ہیں لیکن امریکہ جیسی سوپر پاور اس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر سکی۔ چین کو ۱۹۴۹ کے انقلاب کے بعد ۳۰ سال تک تسلیم نہ کیا گیا اور اس کا مکمل تجارتی مقاطعہ کیا گیا بلکہ ایک وقت آیا کہ امریکہ ہی نہیں، روس بھی اس مشق ستم میں شریک ہو گیا، لیکن حاصل؟۔ جنوبی افریقہ، لیبیا، ایران، عراق، یہ کون سا ملک ہے جو ان کا تختہ مشق نہیں بنا۔

بقول کسنجر، آج دنیا کے ۷۳ ممالک ایسے ہیں جن پر امریکہ نے گذشتہ ۵۰ سال میں کسی نہ کسی وقت معاشی پابندیاں لگائی ہیں لیکن ان کی اثر انگیزی محل نظر ہے۔ جس طرح ندی نالے، پہاڑوں میں پتھروں کے راستہ روکنے کے باوجود اپنا راستہ نکال لیتے ہیں، اسی طرح ان پابندیوں کا بھی توڑ کر لیا جاتا ہے۔ نیز ان کی وجہ سے اندرونی پیداواری صلاحیت میں ترقی ہوتی ہے اور ملک خود کفالت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایران عراق جنگ کے دوران جنگی پیداواری صلاحیت ایران میں چند سالوں میں پیدا ہوئی، وہ عام حالات میں دس پندرہ برس میں بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ خود ہم پر ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ میں پابندیاں لگیں۔ ۱۹۷۹ سے ہم جوہری صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کے جرم میں پابندیوں کی گرفت میں ہیں لیکن کیا ہم نے دس سال میں ساری پابندیوں کے

باوجود وہ صلاحیت پیدا نہیں کر لی جو امریکہ اور روس نے ہم سے دوگنے عرصے میں پیدا کی تھی؟

اگر تحقیقی نظر سے جائزہ لیا جائے تو ملک کی معیشت' کا صرف پندرہ سے بیس فی صد بین الاقوامی تجارت یا سرمایہ کاری سے متاثر ہوتا ہے۔ ۸۵ فی صد معیشت اس کی زد میں نہیں ہے۔ نیز جو حصہ متاثر ہوتا ہے اس کا بھی بمشکل دس فی صد وہ ہو گا جو بلاواسطہ امریکہ اور جاپان کی عائد کردہ پابندیوں سے متاثر ہو گا۔ سرکاری سودے (dealings) پابندیوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ نجی شعبے پر اس کے اثرات محدود ہوتے ہیں یا متبادل راستے کا حصول آسان ہوتا ہے۔ پھر پابندیوں کا اثر صرف پابندی کے شکار ممالک ہی پر نہیں ہوتا' پابندی لگانے والے ملک کے مالیاتی اور تجارتی ادارے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے جب وہ ملک بڑی آبادی والے ہوں جن پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے رہنے والے دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ ہیں' ان پر پابندیوں کی زد ہم پر تو ہے ہی' لیکن خود امریکہ اور جاپان کی صنعت اور تجارت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اگر امریکہ اور جاپان کے پاس پابندیاں لگانے اور مزید قرضے نہ دینے کی قوت ہے تو ہم بھی بالکل بے سہارا نہیں' قرضوں کے باب میں فوری مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں لیکن ان پر قابو پانا مشکل نہیں۔ ہم بھی ماضی کے قرضوں کی ادائگی کو موخر کر سکتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کے تیرہ ممالک نے' پیرو کے راستہ دکھانے کے بعد' یہ طریقہ اختیار کیا اور عالمی ساہو کار قرضوں کی ری شیڈولنگ پر مجبور ہوئے۔ ورلڈ بنک کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق' ۳۱ ممالک ایسے ہیں جن کے قرضے معاف کیے گئے یا ان کے لیے نیا نظام الاوقات بنایا گیا۔ کسی ستم ظریف نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر میں چند ڈالر کا مقروض ہوں تو فکرمند مجھے ہونا پڑتا ہے لیکن اگر قرض کروڑوں اور اربوں کا ہے تو پھر زیادہ فکرمند قرض دار نہیں' قرض خواہ (Lender / Banker) کو ہونا پڑتا ہے۔ بات یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے۔

اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اب تک تجارت کے عمومی معاہدے (GATT) اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے دروبست کے تحت سارا دباؤ ترقی پذیر ملکوں پر رہا ہے کہ تجارت کو آزاد کریں۔ ڈبلیو ٹی او کے دستور میں ایسی گنجایش موجود ہے کہ تجارت پر من مانی پابندیوں کی صورت میں امریکہ' جاپان اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے خلاف بھی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ گو طاقتور سے انصاف کی توقع نہیں لیکن ان کو بھی زچ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن درحقیقت ان پابندیوں سے سب سے اہم فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم قرض اور سود پر مبنی معاشی ترقی کی حکمت عملی کی زنجیروں سے نجات پانے اور اسراف اور تبذیر کی زندگی سے بچنے کی موثر کوشش کریں اور ملک و معیشت کو خود اعتمادی' خود انحصاری' اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور چادر دیکھ

کر پاؤں پھیلانے کے راستے پر لا سکیں۔ اگر قوم اور اس کی قیادت اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح حکمت عملی بنالے اور اٹھ کھڑی ہو تو یہ پابندیاں سب سے بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہیں۔

غریب ملک' بم کی عیاشی: چوتھا اعتراض غربت کے ماحول میں بم کی عیاشی سے عبارت ہے۔ بلاشبہ غربت بہت سے مسائل کا سبب ہے۔ تعلیم' صحت' صفائی اور صاف ستھرے پانی کی کمی سب ہمارے قومی جسم پر ناسور ہیں جن کے علاج کی ضرورت ہے' لیکن ان کے نام پر قومی سلامتی' ملک و ملت کی آزادی اور عزت کو داؤ پر لگا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ملک ہو گا تو تعلیم اور ترقی کا بھی امکان ہے۔ اگر ہم اپنی آزادی اور عزت ہی کھو دیتے ہیں تو تعلیم و ترقی کا حاصل یہ اعتراض ژولیدہ فکری پر مبنی ہے یا مفاد پرست طبقات کے ذہن کی اختراع ہے۔

غربت اور محرومی کی وجہ جوہری صلاحیت کی ترقی پر توجہ یا وسائل کا استعمال نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ وہ ظالمانہ اور استحصالی نظام ہے جو ملک پر مسلط ہے اور جس کی چھتری تلے مفاد پرست عناصر ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ آج ملک ۱۰۰ بلین ڈالر سے زیادہ کے بیرونی اور اندرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر خاندان ۳ سے ۴ لاکھ روپے کا مقروض ہے۔ لیکن ان قرضوں سے فائدہ کتنے لوگوں نے اٹھایا ہے اور ان کا بوجھ پوری قوم پر پڑ رہا ہے۔

جوہری صلاحیت کی ترقی تو قومی سلامتی کے لیے ضروری ہے اور یہ نسخہ کم خرچ بالانشین ہے۔ غربت کا خاتمہ کرنے اور تعلیم و صحت کی سہولتوں کو فراہم کرنے کے لیے جس جدوجہد اور معاشی حکمت عملی کی ضرورت ہے اور اس کے لیے لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کے جس بازار کو بند کرنے کی ضرورت ہے آیئے' اس کی طرف توجہ دیں۔ اس کے لیے جوہری صلاحیت پر خرچ بچانے کی ضرورت نہیں!

اخلاقی سوال: آخری اعتراض دینی اور اخلاقی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے۔

بلاشبہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے جنگ اور دشمنی کے لیے بھی اخلاقی ضابطہ بنایا اور ہم ایک مسلمان امت کی حیثیت سے اس ضابطے کے پابند ہیں۔ اسلام نے حربی (belligerent) اور غیر حربی (non belligerent) میں تمیز کی اور ایک کو جنگ میں ہدف بنایا اور دوسرے کو تحفظ عطا کیا۔ دنیا کو آج پہلے سے بھی زیادہ ان تعلیمات کی ضرورت ہے اور ہمیں ان کا علم بردار ہونا چاہیے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہماری نیوکلیر ہی نہیں پوری دفاعی پالیسی میں عام تباہی (mass destruction) کے تمام اسلحے سے دنیا کو فی الحقیقت پاک کرنے کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ہمیں اس بارے میں پیش بین (pro-active) پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس طرح ماحولیات پر مضر اثر ڈالنے والی تمام سرگرمیوں کی فکر ہونی چاہیے جو تابکاری سے لے کر ہوا' پانی اور غذا ہر ایک کو آلودگی سے پاک کرنے سے عبارت ہو۔ ہم

سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سارا واویلا صرف جوہری صلاحیت کے سلسلے میں کیوں ہے؟ مسئلہ ہمہ گیر ہے اور اس کا حل بھی ہمہ گیر ہی ہو سکتا ہے۔

ہم واضح کر چکے ہیں کہ جوہری اسلحہ کا اصل مقصد ان کا استعمال نہیں' بلکہ سد جارحیت ہے۔ یہ جنگ کے لیے نہیں جنگ کو روکنے اور اس کی تباہ کاریوں سے اپنے علاقے اور پوری دنیا کو بچانے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان دو ملکوں کے درمیان کبھی کوئی جنگ نہیں ہوئی جو ایٹمی اسلحہ سے مسلح ہوں اور دونوں کو پتا ہو کہ جنگ کے نتائج کیا ہوں گے۔ ایٹمی جنگ ان ممالک پر مسلط کی گئی' جو خود ایٹمی اسلحے سے محروم تھے اور دشمن کے لیے تر نوالہ بن گئے۔ اگر جاپان کے پاس بھی ۱۹۴۵ میں ایٹمی اسلحہ ہوتا تو امریکہ اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم نہیں گرا سکتا تھا۔ ہمارے سامنے ایٹمی صلاحیت کا حصول جنگ کو روکنے کے حالات پیدا کرنے کے لیے ہے' دنیا کو جنگ میں جھونکنے کے لیے نہیں' اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں شریعت نے عام قاعدے کے ساتھ استثنا کے اصول کی گنجایش رکھی ہے۔

جنگ ایک ناپسندیدہ چیز ہے لیکن الفتنہ اشد من القتل یعنی فساد و فتنہ قتل سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔ اسلام جان و مال کی حفاظت کے لیے آیا ہے لیکن ایمان اور آزادی کے تحفظ کے لیے جان و مال کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے۔ فقہا تو یہاں تک گئے ہیں کہ گو ایک معصوم انسان اور ہر کلمہ گو کی جان سب سے قیمتی متاع ہے اور جائز حق کے بغیر اسے تلف کرنا پوری انسانیت کو تباہ کرنے کے مترادف ہے' لیکن اگر کفار کے ساتھ جنگ میں کفار معصوم مسلمانوں کو ڈھال بنا کر دارالاسلام کو تباہ کرنے کی لڑائی لڑیں تو ایسی لڑائی میں ڈھال (human shields) کے طور پر استعمال کیے جانے والے افراد کو بھی نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ سب ناپسندیدہ اور استثنائی صورتیں ہیں لیکن زندگی کے تلخ حقائق کا مقابلہ کرنے اور بڑی برائی اور معصیت سے قوم و ملت کو بچانے کے لیے ان تمام اقدام کی گنجایش ہے۔ انھی کی روشنی میں ہم اس رائے کے حامل ہیں کہ قومی سلامتی کے تحفظ اور مسلمانوں کی آزادی اور عزت کی حفاظت کے لیے ایٹمی صلاحیت پر مبنی سد جارحیت ضروری ہے تاکہ جنگ کے خطرے سے خود بھی بچا جائے اور دوسروں کو بھی بچایا جا سکے اور مدمقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا جا سکے:۔

ہاتھ میں مت اٹھایئے پتھر
آپ شیشے کے گھر میں رہتے ہیں

پس چہ باید کرد

جوہری تجربے کے منفی اثرات اور حقیقی اور خیالی خدشات کے اس جائزے کے بعد' اب ضرورت ہے

کہ مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح حکمت عملی کے خدوخال واضح کیے جائیں تاکہ قوم کے سامنے اصل ایجنڈا اپنی صحیح شکل میں آجائے۔

سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ ان بنیادوں کو ایک بار پھر واضح کر دیا جائے جن پر قومی ایجنڈے کو مرتب ہونا چاہیے۔ وہ بنیادیں یہ ہیں:

۱- پاکستان کی اصل منزل ایک حقیقی اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام ہے تاکہ قرآن و سنت کے دیے ہوئے دستور حیات پر عمل ہو سکے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔ ہماری آزادی کی منزل اللہ کی غلامی میں زندگی گزارنے کا موقع اور صلاحیت کار کا حصول ہے۔

۲- پاکستان امت مسلمہ کا حصہ اور اس کا خادم ہے۔ ہم پاکستان کو مضبوط اور طاقت ور اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ اہل پاکستان بھی محفوظ اور باوقار زندگی سے شاد کام ہو سکیں اور ہم امت مسلمہ کے لیے تقویت کا باعث ہوں اور اس کی عزت و وقار میں اضافے کا ذریعہ بنیں۔

۳- عالمی سیاست جس رخ پر دنیا کو لے جا رہی ہے اس میں پاکستان اور امت مسلمہ کی آزادی اور نظریاتی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت، اجتماعی خود انحصاری کے اصول پر اپنی ترقی اور استحکام ہی میں ممکن ہے۔ ہم دنیا کا حصہ ہیں اور اس سے کٹنے (isolation) کا کوئی سوال نہیں لیکن بڑی طاقتوں کا بے جان مہرہ بن کر نہ ہم اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکیں گے اور نہ نظریاتی اور تہذیبی تشخص کو۔ اس لیے بیرونی دنیا کی محتاجی کو کم سے کم تر کرنا اور خود انحصاری کی بنیاد پر اپنے ملکی اور بالآخر ملی وسائل کی ترقی ہی میں روشن مستقبل کے امکانات مضمر ہیں۔

۴- شریعت اور قانون کی بالادستی، انسانی حقوق کا تحفظ، جمہوری اور شورائی نظام کا قیام، عدل و انصاف اور امن و امان کا حصول، سیاسی اور صحافتی آزادیوں کا احترام، عدلیہ کی آزادی، مبنی بر انصاف احتساب اور جواب دہی کے نظام کا قیام، صاف ستھری سیاست اور استحصال اور ظلم سے پاک معیشت کا قیام اور ملک و ملت کے تمام ارکان و عناصر کے لیے باعزت زندگی کے تمام مواقع کی منصفانہ فراہمی کو ہمارے اجتماعی نظام کی شناخت ہونا چاہیے۔

۵- اخروی کامیابی اور پوری دنیا میں انسانی زندگی کی اخلاقی بنیادوں پر تشکیل جدید کا انحصار بالآخر امت مسلمہ کی اپنی نظریاتی اور تاریخی بنیادوں پر منظم ہونے اور ترقی کرنے پر ہے۔ پاکستان اور تمام مسلمان ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف اخلاقی اور نظریاتی حیثیت سے اپنی شیرازہ بندی کریں تو دوسری طرف معاشی، مادی، فنی، عسکری، سائنسی، علمی، سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں وہ قوت حاصل کریں کہ دنیا کے سامنے ایک نیا نمونہ اور مثالیہ (paradigm) آسکے۔

انھی اہداف کی طرف پیش قدمی کے لیے برعظیم کے مسلمانوں سے تحریک پاکستان برپا کی تھی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو اسی خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے یہ ملک وجود میں آیا تھا۔

دس نکاتی لائحہ عمل: ۲۸ مئی ۱۹۹۸ کے تاریخی اقدام نے ایک بار پھر اس قوم کو اپنی اصل منزل کی طرف پیش قدمی کرنے کا زریں موقع دیا ہے اور وہ حالات رونما ہوئے ہیں جن سے بھرپور استفادہ کر کے قومی زندگی کے بالکل ایک نئے باب کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے جن اہم چیزوں کی ضرورت ہے، ہم یہاں ان کی نشان دہی کر رہے ہیں اور قوم اور اس کی قیادت کو دعوت دیتے ہیں کہ اپنے ذاتی مفادات اور گروہی تعصبات سے بالا ہو کر ان تاریخی امکانات کو حقیقی بنانے کی سعی کریں جو آج ہمارے سامنے ہیں اور دعوت عمل دے رہے ہیں۔

۱- جوہری دھماکے نے قوم کو ایک نئی امنگ اور جذبہ ہی نہیں دیا، اسے ایک بار پھر متحد کر دیا ہے۔ بڑی بدقسمتی ہو گی اگر حکومت کی عاقبت نااندیش کارروائیاں اس اتحاد کو پھر منتشر کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ یہ وقت ذاتی اقتدار کی دوڑ کا نہیں اور نہ سیاسی حساب کتاب درست کرنے کا ہے۔ اگر سیاسی قیادت ذرا بھی ہوش مندی سے کام لے تو بہ آسانی تمام تعمیری قوتوں کو ایک متفقہ ایجنڈے پر جمع کیا جا سکتا ہے اور ساری قومی صلاحیتوں کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کیا جا سکتا ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے کہ اس زریں موقع کو ضائع کیا جا رہا ہے اور نہایت سہل انگاری کے ساتھ ایسے مسائل اٹھائے جا رہے ہیں کہ قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے، صوبائی تعصبات کو بھڑکایا جائے اور علاقائی رنجشوں کو ہوا دی جائے۔ اگر ہم نے یہ موقع ضائع کر دیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور ڈر ہے کہ کہیں ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہ دیں۔ العیاذ باللہ۔

۲- قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے امن و امان کی صورت حال پر فوری قابو پانے کی ضرورت ہے۔ دشمن، ملک کو اندرونی مشکلات اور تنازعات میں مبتلا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم دشمن کے اس کھیل میں شریک نہ ہوں بلکہ قوم کو بیدار کریں اور ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی صفیں آراستہ کریں۔ جس انداز میں اور دستور کی جن دفعات کے تحت ایمرجنسی نافذ کی گئی ہے وہ کوئی نیک فال نہیں۔ اگر حکومت کو کچھ مالی اور معاشی معاملات کو قابو میں رکھنے کے لیے کچھ اختیارات درکار تھے تو دستور ہی کے تحت دوسرے ذرائع سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اس کے لیے بنیادی حقوق کو معطل کرنا اور عدالتوں کو بے اختیار بنانا ہرگز ضروری نہیں تھا۔ اس کی جلد تلافی ہونی چاہیے، ورنہ یہی خطرہ ہے کہ ملک جلد ہی کسی نئی سیاسی کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا اور قومی اتحاد اور تعمیر نو کے لیے جو زریں موقع ہاتھ آیا ہے وہ خدانخواستہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

۳- ایسی قومی مشاورت کا فی الفور انتظام ہونا چاہیے جو محض ٹی وی' ریڈیو یا اخبارات کی آرایش کے لیے نہ ہو بلکہ دلوں کو جوڑنے' قومی امور پر گہرائی میں جاکر مشورہ کرنے اور مل جل کر مشترک مسائل اور خطرات کا حل تلاش کرنے کے جذبے سے کام کرے۔ اس کے لیے ابتدا حکومت کو کرنی چاہیے۔ یہ کام ۲۸ مئی کے فوراً بعد ہونا چاہیے تھا۔ اگرچہ بہت تاخیر ہوگئی ہے لیکن ابھی موقع ہے' شاید پھر یہ موقع بھی باقی نہ رہے۔ قوم کے سینئر افراد کو بھی اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

۴- خارجہ پالیسی کو واضح اور مربوط انداز میں مرتب کرنے اور اس کے موثر نفاذ کے لیے فوری اقدام درکار ہیں۔ ستم ظریفی ہے کہ ایسے نازک وقت پر وزیر خارجہ کی حیثیت بھی واضح نہیں کہ وہ استعفٰی یا re-assignment' کے بعد محض نگراں (care taker) کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں یا کسی اور پوزیشن میں ہیں۔ ہمیں اس امر کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ برسوں بعد پہلی بار وزارت خارجہ کے ترجمان اور اس کی وزیر کے ایسے بیان اس زمانے میں آئے ہیں جو قومی امنگوں سے ہم آہنگ اور بیورو کریسی کے روایتی انداز سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ ایک وقتی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ نئے حالات کی روشنی میں خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کو اولیں ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب امریکہ اور بڑی طاقتیں خود پریشان ہیں کیوں کہ ان کی اب تک کی حکمت عملی ناکام رہی ہے اور وہ نئے اقدام (initiatives) کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ پابندیوں کی سیاست بار آور نہیں ہو سکتی۔ این پی ٹی اور سی ٹی بی ٹی غیر موثر ہو گئی ہیں۔ جوہری بحث کا ایشو بدل گیا ہے۔

اب مسئلہ عدم پھیلاؤ کا نہیں' بلکہ بالکل ایک نئے جوہری توازن کا ہے۔ نیز خود جوہری ہتھیاروں پر چند ممالک کی اجارہ داری اور ان کو تلف کرنے کے بارے میں بڑی طاقتوں کی منافقانہ روش موضوع بحث بن گئی ہے۔ امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اس مسئلے پر زیادہ دیر خاموشی ممکن نہیں اور کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ کشمیر کا مسئلہ عالمی سطح پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ شرق اوسط میں نام نہاد امن کی امریکی پالیسی دم توڑ رہی ہے۔ اس پس منظر میں جوہری تجربات نے خود شرق اوسط کے لیے نئی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ شمالی کوریا نے برملا کہہ دیا ہے کہ جانب داری اور امتیازی پالیسی ختم کرو ورنہ میزائل کی تجارت سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ چین نے نئے تجربات کے امکانات کا اشارہ دے دیا ہے۔

مشرقی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے معاشی بحران نے نئی کروٹ لی ہے اور اب ایک طرف جاپان اور چین اس کی زد میں آ گئے ہیں اور دوسری طرف اس کے اثرات امریکہ اور یورپ پر نمایاں ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ بڑا ہی فیصلہ کن وقت ہے۔ اس وقت ایک موثر خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف پاکستان کے موقف کو بڑے مضبوط اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا جائے اور دوسری طرف امت

مسلہ کو ایک عالمی ایجنڈے پر متحد کیا جا سکے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم ان تمام معاملات اور ایشوز کو موثر انداز میں بین الاقوامی بنائیں اور دوسروں کو اس عمل میں شریک کریں تاکہ ان کے حل کے لیے مناسب فضا پیدا ہو سکے۔ آج وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے' جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا تھا۔

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا' وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

اگر ہم تساہل یا الجھن کا شکار ہو گئے تو یہ تاریخی موقع ہاتھ سے نکل جائے گا یا دوسرے فائدہ اٹھالیں گے۔

۵- پاکستان کی ایٹمی پالیسی کو بھی' اس وقت بڑے واضح انداز میں مرتب کرنے اور اسے موثر طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

(الف) دنیا کو' ایشیا کو اور جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک بنایا جائے۔ اصل مسئلہ ایٹمی اسلحے کے اتلاف کا ہے اور یہ کام ان تینوں سطحوں پر درکار ہے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم (initiative) ہمارا ہو اور عالمی اور علاقائی سطح پر ضروری کارروائیاں کی جائیں۔ پاکستان اور بھارت اب ایٹمی ممالک ہیں اور ان کی اس حیثیت کو' دنیا کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے کام نہیں چل سکتا۔ البتہ یہ ہمارا کام ہے کہ عالمی گفتگو اور موضوع بحث کو بدلنے کی بھرپور جدوجہد کریں اور امریکہ پر عالمی دباؤ کو اتنا بڑھائیں کہ اسے ایجنڈا تبدیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

اس سلسلے کے چار اہم معاہدات:

(i) Non. Prolification Treaty (NPT)

(ii) Comprehensive Test Ban Treaty (CTBT)

(iii) Missile Technology Control (MTCR)

(iv) Fissile Material Cut Off Convention (FMCC)

کئی اعتبار سے اذکار رفتہ ہو گئے ہیں۔ ان سب پر نئی گفتگو اور کسی نئے عالمی معاہدے اور نظام کار کی تیاری کی .ضرورت ہے۔ اس کے لیے بھی ہمیں' چین اور مسلم ممالک کے مشورے سے نیا اقدام (initiative) کرنا چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

(ج) پاکستان میں قومی سلامتی اور جوہری نظام کو دفاعی نظام میں ضم کرنے کے لیے ضروری اقدامات۔

(د) جوہری دھماکوں کے منطقی تقاضوں --- یعنی محدود اور متعین اسلحہ سازی' ترسیلی نظام کی مزید ترقی' نگرانی اور جاسوسی کے نظام کو بہتر بنانا اور تنسیق و تحکیم کے نظام کا استحکام۔

(ہ) عالمی سطح پر مذاکرات ضرور شروع کیجیے اور اس میں پہل کیجیے لیکن اپنی پوری تیاری سے پہلے کسی معاہدے میں شرکت کی غلطی ہرگز نہ کریں۔ ہمیں وقت کی ضرورت ہے اور اس وقت کے صحیح استعمال کی فکر بھی ضروری ہے۔

(و) جو افراد سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں میں پہل کا مشورہ دے رہے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ اس معاہدے میں بڑے جھول ہیں جن کی اصلاح اور اپنے مفادات کے تحفظ کی ضمانت کے بغیر اس پر دستخط مہلک ہو سکتے ہیں۔ ہاں بات چیت ضرور شروع کریں اور اس کے لیے اپنی تیاری (home work) ذرا سلیقے سے کریں۔

(ز) پہلے حملہ کرنے پر پابندی کے کسی معاہدے پر ہرگز بات چیت نہ کریں۔ یہی ہمارا سودا بازی کا اصل ہتھیار اور قابل اعتبار سدجارحیت کا اہم جزو ہے۔ یہ کام اخباری بیان بازی کا نہیں، گہرے سوچ بچار، ٹھوس تحقیق اور سمجھ داری سے اپنی ایٹمی پالیسی کی تشکیل کا ہے۔ یہ کام محض سیاست دانوں کے کرنے کا نہیں۔ سائنس دانوں، بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین، فوجی قیادت اور وزارت خارجہ کے تجربہ کار افراد کے مشورے سے، قومی قیادت کو ایٹمی پالیسی مرتب کرنا چاہیے۔

۶۔ کشمیر پالیسی اور اس کے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے، مختلف محاذوں پر کرنے کے کاموں کا تعین، اور اس کے لیے عملی اقدامات بھی وقت کی ضرورت ہیں۔ اپنے اصولی موقف سے سرمو انحراف تباہ کن ہو گا۔ گو عالمی سطح پر کشمیر کے مسئلے کا ذکر ہو رہا ہے اور حل کی بات بھی ہو رہی ہے لیکن اس میں تین بنیادی چیزوں کی کمی ہے:

الف۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے فریم ورک میں مسئلے کا حل۔

ب۔ کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق حل اور مذاکرات کے عمل میں مقبوضہ کشمیر کی معتمد علیہ قیادت (حریت کانفرنس) کی شرکت۔

ج۔ دو طرفہ مذاکرات کی ناکامی یا ان کے نتیجہ خیز نہ ہونے کی وجہ سے کثیر طرفی (multi-lateral) مذاکرات یا تیسری پارٹی (اقوام متحدہ / بین الاقوامی شرکت بطور ثالث، یا کم از کم گواہ) تاکہ بھارت کو گھیرا جا سکے۔

ان تینوں امور کو اجاگر کرنے اور عالمی رائے کو ان کے حق میں ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے مسئلے پر دو طرفہ مذاکرات سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ وقت ہے کہ اس بات کا کھل کر اظہار کیا جائے اور مسئلے کو کلی طور پر بین الاقوامی بنایا جائے۔

سب سے اہم چیز مقبوضہ کشمیر میں تحریک مزاحمت کی مکمل اور جرات مندانہ مدد ہے۔ یہ مدد اخلاقی اور سفارتی بھی ہو اور عملی اور مادی بھی۔ اس میں پوری قوم کی شرکت بہت ضروری ہے اور اس کے لیے موثر

تحرک (mobilisation) ہونا چاہیے۔ عالمی سفارتی محاذ پر کام اور تحریک مزاحمت کی مدد، ہماری کشمیر پالیسی کے دو بنیادی ستون ہیں اور ان دونوں کو کشمیر پالیسی میں برابر کی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

۷۔ ملکی معیشت کی خود انحصاری کی بنیاد پر تعمیر نو بھی وقت کا اہم ترین چیلنج ہے۔ قرضوں اور سود کی معیشت پر مبنی معاشی ترقی کی حکمت عملی کی عمارت زمین پر آ رہی ہے۔ اس کی عبرت ناک ناکامی کے بعد اب بھی کسی نہ کسی ڈھکی چھپی شکل میں نئے قرضوں ہی کی امید پر مہلت حیات کی تلاش حماقت ہی نہیں مکمل تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہو گی۔ یہ وقت معیشت میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کا ہے۔ مراعات یافتہ، مفاد پرستی کے نظام کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ مزید قرضوں پر قانونی پابندی لگنی چاہیے۔ سودی نظام کو ختم کرنے کے عمل کا فوری آغاز ہونا چاہیے اور اس کے لیے خود انحصاری کمیٹی (۱۹۹۱) کی سفارشات کی روشنی میں خود انحصاری قانون لاگو ہونا چاہیے تاکہ اس سے انحراف ممکن نہ رہے۔ راجا ظفرالحق نے سود کو ختم کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا ہے اور وہ بڑا حقیقت پسندانہ اور فنی اعتبار سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ افسوس ہے کہ حسب سابق، وزارت خزانہ اور اسٹیٹ بنک اس کی راہ میں حائل ہیں اور ایک سال ہونے کو آ رہا ہے اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اس رپورٹ پر عمل در آمد کو اولین اہمیت دینی چاہیے اور اس پورے عمل کی نگرانی کے لیے کمیٹی ہی کے ارکان پر مشتمل ایک بااختیار مستقل کمیشن یا Prime Minister Council of Economic Advisors بننی چاہیے تاکہ یہ کام وزارت خارجہ کے افسروں کے چنگل سے نکالا جا سکے اور ایک شفاف انداز میں قوم کو اعتماد میں لے کر اسے انجام دیا جائے۔ اس کے لیے اسٹیٹ بنک کو بھی نئی ہدایات ملنی چاہییں۔ اسے مزید آزادی دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ سیاسی مداخلت کے بغیر بنک کاری کے نظام کی نگرانی، رہنمائی اور احتساب کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ گورنر کی مدت ملازمت بڑھائی جائے اور اسے ناقابل توسیع (non-extendable) قرار دیا جائے۔ نیز ماہرین پر مشتمل کمیٹی، بڑی حد تک بنک آف انگلینڈ کی کمیٹی کے نمونے پر بنائی جائے تاکہ ایک بااختیار ادارہ خالص پیشہ ورانہ انداز میں سیاسی مصلحتوں کے دباؤ کے بغیر مرکزی بنک کاری کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور مقاصد کے حصول کی کوشش اور طے شدہ اصول کار پر عمل کر سکے جو اچھی بنک کاری، قرضوں کی واپسی اور سود کی خاتمے کے سلسلے میں طے کیے جائیں۔

معاشی خود انحصاری کے حصول کی حکمت عملی میں زراعت کی ترقی، چھوٹی صنعت اور کاروبار کو قرار واقعی مراعات اور incentives کی فراہمی، بنک کاری کی اصلاح اور آسان شرائط پر سرمایہ کاری کی سہولتوں کا اہتمام، بااختیار ٹیرف کمیشن کا قیام، نج کاری کمیشن اور پالیسی اور در آمدی برآمدی پالیسی کی تشکیل نو ضروری ہے۔ یہ سارے کام کسی تاخیر کے بغیر ہونے چاہییں۔

۸- مندرجہ بالا امور و معاملات کے ساتھ ہماری نگاہ میں احتساب کے نظام کو غیر جانب دار اور موثر بنانا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ملک کے عدالتی نظام کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس میں خالص میرٹ پر سیاسی جنبہ داری سے پاک اتنی تعداد میں تقرریاں ضروری ہیں کہ لوگوں کو انصاف جلد میسر آسکے۔ احتساب کی مشینری کو بھی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح کلی طور پر آزاد ہونا چاہیے اور آزاد اور بااختیار پبلک پرازی کیوٹر کو عدالتی احتساب کمیشن کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس کا کوئی تعلق وزیراعظم یا کسی سیاسی دفتر سے نہیں ہونا چاہیے اور اس کا کام بھی شفاف ہونا چاہیے۔

۹- جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا خاتمہ اسلامی اصولوں کے مطابق بہت ضروری ہے، لیکن جہاں یہ کام اور زندگی کے دوسرے شعبوں کو ارتکاز دولت و قوت سے پاک کرنے کا موثر انتظام ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ پورا کام عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق انجام پائے اور اسے سیاسی انتقام کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ کالاباغ ڈیم کا مسئلہ علاقائی یا صوبائی نہیں، قومی ہے اس کا فیصلہ سیاسی رسہ کشی کے ذریعے نہیں بلکہ خالص فنی بنیادوں پر ملک و ملت کے بہترین مفاد میں کیا جانا چاہیے۔ نیز اس پر سیاسی کشتیاں نہ لڑی جائیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ مشاورت کے ذریعے اس پر اتفاق رائے مہیا کیا جائے۔

۱۰- یہ سارا کام اس وقت کامیابی سے انجام پا سکتا ہے جب افراد ملت کی اخلاقی تعلیم و تربیت ہو، ملک کے تعلیمی نظام کی نظریاتی اور ملی بنیادوں پر تشکیل نو ہو، ریڈیو، ٹی وی اور میڈیا کی قوت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے، آزادی اظہار کا احترام کیا جائے اور ملی ثقافت اور تہذیبی شعائر کو فروغ دیا جائے۔ قوم میں ایمانی جذبہ کو بیدار کیا جائے اور اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد، قربانی اور قوت کے حصول کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں جذبہ جہاد بیدار کیا جائے، اس لیے اسلام کا تصور جہاد محض میدان جنگ تک محدود نہیں، اگرچہ اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ تو پوری زندگی کا ایک انقلابی تصور دیتا ہے جس کے تحت انسان مقصد حیات اور اعلیٰ اقدار کے لیے اپنی قوت کی ہر رمق صرف کرنے کی ہمہ گیر جدوجہد کرتا ہے، قوت حاصل کرتا ہے اور قوت کو انصاف کے قیام اور ادائے حق کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جوہری دھماکے کا بھی اصل پیغام یہی ہے۔ ملت کا ہر فرد اور قوم بحیثیت مجموعی ادائے فرض کے لیے کمربستہ ہو جائے اور وقت کے دھارے کو موڑنے کی جدوجہد کو کامیاب کرکے جان اور مال کی بازی لگا دے بہ قول اقبال:-

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

فہم حدیث

شکر کا رویّہ

مولانا عبد المالک

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکڑیوں کے ان تختوں پر یا اس منبر پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا: جس نے تھوڑے کا شکر نہ کیا' وہ زیادہ کا شکر بھی نہیں کرے گا۔ جس نے انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکے گا۔ اللہ کی نعمت کو بیان کرنا شکرگزاری ہے اور اسے بیان نہ کرنا ناشکری ہے۔

شکریہ ادا کرنا زندگی کے ایک رویے کا اظہار ہے' یہ بناوٹی نہ ہو' دل سے ہو۔ ایک انسان کے ساتھ دوسرے کتنی ہی چھوٹی بڑی بھلائیاں اور نیکیاں کرتے ہیں۔ اس پر دل میں شکر کا جذبہ بیدار ہونا چاہیے' یہ سلامت طبع اور احسان شناسی کا تقاضا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص انسان کی بھلائیوں پر تو شکریہ ادا کرے لیکن اللہ کی بے پایاں نعمتوں پر شکر کا رویہ اختیار نہ کرے۔ شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نعمت کا تذکرہ کیا جائے۔ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کیا جائے تو کیا نہیں جا سکتا' ہر سانس' ہر لقمہ' ہر گھونٹ---- نعمتیں ہی نعمتیں۔

نعمتوں کا احساس' شکر کا جذبہ اور شکر کا رویہ انسان کو بے شمار نفسیاتی عوارض سے محفوظ رکھتا ہے' انسان زندگی کے بارے میں مثبت رویہ اپناتا ہے اور نیک کاموں کے لیے تیار رہتا ہے۔

○

حمید ایک مکی آدمی سے بیان کرتے ہیں جس کا نام یوسف تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک قریشی آدمی چند یتیموں کے سرپرست تھے' ان کے مال کے متولی تھے۔ ایک آدمی مجھ سے ہزار روپے لے گیا اور (وعدہ کے مطابق) واپس نہ کیے۔ اتفاقاً اس کے ایک ہزار روپے کسی طرح میرے ہاتھ آ گئے۔ یوسف کہتے ہیں کہ میں نے قریشی سے کہا کہ فلاں آدمی میرے ہزار روپے لے گیا ہے اور واپس نہیں کیے۔ میں اس کے ایک ہزار روپے جو میرے پاس آ گئے ہیں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ قریشی نے مجھے کہا کہ میرے والد نے مجھ سے حدیث بیان کی کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا "جس نے آپ کے پاس امانت رکھی ہے اس کی امانت ادا کرو اور اس کی خیانت نہ کرو جو تمھارے ساتھ خیانت کرتا ہے"۔ (الفتح الربانی' ج ۱۹)

اپنا حق وصول کرنا جائز بلکہ ضروری ہے لیکن اس کے لیے معروف طریق کار اختیار کرنا چاہیے، جو بات چیت اور مذاکرات کا راستہ ہے۔ اپنا حق طلب کیا جائے۔ اگر کسی سے حق وصول نہیں ہو رہا تو اس کے لیے یہ طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ ہاتھ آئی ہوئی چیز بلا اطلاع اور بلا اجازت اور ملے کیے بغیر اپنے پاس رکھ لی جائے۔ بلکہ متعلقہ شخص کو اطلاع دی جائے کہ آپ کی رقم میرے پاس آئی ہے اور میری رقم آپ کے ذمہ ہے۔ لین دین کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آپ میری رقم بعد میں دیں گے اور اپنی رقم اب لیتے ہے یا پھر میں یہ رقم اپنے قرضے کے بدلے میں رکھ لوں، کون سا طریقہ آپ کو پسند ہے۔ یوں مذاکرات کے ذریعے معاملہ طے کیا جائے۔

یہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ جو تیرے ساتھ خیانت کرتا ہے تو اس کے ساتھ خیانت نہ کر یعنی اپنا حق وصول کرنے کا طریق کار بھی خیانت سے پاک ہو۔ قریشی کا اپنے ساتھی کو حدیث سنانے کا یہی مطلب تھا کہ آپ بات چیت کے ذریعے معاملہ طے کریں، ویسے ہی رقم دبا کر نہ بیٹھ جائیں۔

○

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری کو ایک حاجت درپیش تھی۔ اس کے گھر والوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے جائیں اور آپ سے اپنی حاجت مانگیں۔ وہ چلا آیا، پہنچا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرما رہے تھے۔ آپ کے کلمات طیبات یہ تھے "جس نے سوال سے بچنے کی کوشش کی، اللہ اسے سوال سے بچا دے گا، جو بے نیازی اختیار کرنا چاہے اللہ اسے بے نیاز کر دے گا، جس نے ہماری طرف رجوع کیا اور ہمارے پاس اسے دینے کے لیے کچھ ہو گا تو ہم اسے دے دیں گے"۔ آپ کا یہ خطاب سن کر اس کی کایا پلٹ گئی۔ وہ بغیر سوال کیے واپس چلا گیا اور سوال سے بچنے کی کوشش شروع کر دی۔ (الفتح الربانی، ج ۱۹)

ہر انسان کو ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے جسے پورا کرنے کے وسائل اس کے پاس نہ ہوں۔ ایسی صورت میں دو رویے ہو سکتے ہیں۔ کسی کے پاس جا کر دست طلب دراز کرنا، یا اس سے بچنے کی کوشش کرنا، ضرورت کو موخر کرنا اور اللہ سے اچھی امید رکھنا۔ ہمارے رسولؐ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان سوال سے بچے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے مناسب حالات پیدا کر دے گا۔

اس کا اطلاق قومی رویوں پر بھی ہوتا ہے۔ مانگنا مسلمانوں کے شایان شان نہیں۔

○

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ فلاں آدمی کی میرے باغ میں ایک کھجور ہے۔ اس سے مجھے تکلیف ہے۔ اس کی کھجور کا میرے باغ میں ہونا میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بلا بھیجا۔ وہ آیا تو آپؐ نے

فرمایا فلاں کے باغ میں اپنی کھجور مجھے فروخت کر دو۔ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا فروخت نہیں کرتے تو مجھے ہبہ کر دو' اس نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا جنت میں ایک کھجور کے بدلے میں مجھے اپنی کھجور فروخت کر دو۔ اس نے کہا: نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: میں نے تجھ سے بڑا بخیل نہیں دیکھا سوائے اس شخص کے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے"۔ (الفتح الربانی' ج ۱۹)۔

کسی کو سلام کرنے میں آدمی کو نہ تو کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے نہ کوئی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ صرف زبان کو حرکت دینا ہوتی ہے۔ سلام کے ذریعے دعا دے کر انسان دوسرے کے دل کو جیت لیتا ہے' اس سے تعلق پیدا کرتا ہے' تعلق کو بڑھاتا ہے اور اسی تعلق کے ذریعے دوسرے کا تعاون' ہمدردی اور محبت حاصل کرتا ہے۔ اگر ایک شخص سلام کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو اس میں بھی بخل سے کام لیتا ہو تو اس سے بڑا بخیل کون ہو گا؟ جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر اپنی کھجور ہبہ نہ کی' فروخت نہ کی' اس آدمی کی بدبختی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ سلام کرنے میں بخل سے کام لینے والا ایسے شخص سے بھی بڑا بدبخت ہے' یقیناً' جیسا کہ اللہ کے رسول نے فرمایا۔ سلام کلام نہ کرنے والے کے خشک رویے کی کراہت کو اس سے زیادہ بہتر شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

○

ہشام بن حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ ان کا چند ذمیوں پر گزر ہوا جو شام کے علاقے میں دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کو کیوں دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ان کے ذمہ خراج کی کچھ رقم باقی ہے۔ تو اس پر انھوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے تھے۔ ان دنوں فلسطین میں عمیر بن سعد امیر تھے۔ چنانچہ ہشام بن حکیم ان کے پاس گئے اور انھیں حدیث سنائی تو انھوں نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام لوگوں سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو لوگوں کو دنیا میں سب سے زیادہ عذاب دیتے تھے۔ (الفتح الربانی' ج ۱۹)

آنکھیں اس دور کی پھر منتظر ہیں جب کسی مسلمان ملک کے ڈپٹی کمشنر' گورنر' صدر یا وزیراعظم کو کوئی آیت یا حدیث سنائی جائے اور وہ بلاچوں وچرا اس کے مطابق عمل کر دے!

آج کے مہذب معاشروں میں جسمانی تعذیب دینے اور ٹارچر کرنے کی روایت بہت مضبوط ہو گئی ہے۔ مسلمان ممالک بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مصر' شام' عراق' الجزائر اور دوسرے مقامات کے روح فرسا واقعات برابر علم میں آتے رہتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں پولیس کا اقبال جرم کرانے کے لیے تھرڈ ڈگری رویے کا استعمال معلوم و معروف ہے۔ اب تو سیاسی مخالفوں کو تعذیب دینے کا سلسلہ بھی شروع ہے۔ یقیناً' تعذیب کا حکم

دینے والے اور اس حکم کو ماننے والے اس حدیث کا مصداق ہیں کہ آخرت میں ان لوگوں کو سب سے زیادہ عذاب ہو گا۔ چوری کے شبے میں گھر کے ملازموں پر مالکوں کے اپنے یا پولیس کے ذریعے مظالم اسی تعریف میں آتے ہیں، جس میں جان تک چلی جاتی ہے۔

ہمارے معاشروں میں خدا کا ذکر تو بہت ہے، لیکن لگتا ہے کہ خدا سے بے خوفی بھی بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔

○

وابصہؓ بن معبد اسدی سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں چاہتا تھا کہ تمام نیکیوں اور تمام گناہوں کے بارے میں سوال کر ڈالوں اور کسی نیکی اور کسی گناہ کو پوچھے بغیر نہ چھوڑوں۔ آپ کے ارد گرد مسلمانوں کی ایک جماعت تھی جو سوالات کر رہی تھی تو میں (جوش و جذبہ میں) ان سے گزر کر آگے جانے لگا، اس پر لوگوں نے کہا وابصہؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہو۔ میں نے کہا مجھے چھوڑ دو، آگے جانے دو، اس لیے کہ آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں کہ میں آپ کے قریب ہو جاؤں۔ اس پر آپ نے فرمایا: وابصہؓ کو چھوڑ دو۔ اسے آنے دو۔ پھر فرمایا: وابصہؓ قریب آ جاؤ۔ دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا۔ کہتے ہیں کہ میں آپ کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کے بالکل سامنے پہنچ کر بیٹھ گیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: وابصہؓ، میں تمھیں بتاؤں جو تمھیں پوچھنا ہے، پوچھنا ہے یا تم سوال کرو گے؟ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ آپ ہی بتلا دیجیے۔ آپ نے فرمایا: تم آئے ہو کہ مجھ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کرو۔ وابصہؓ نے کہا: ہاں یارسولؐ اللہ! آپؐ نے اپنی انگلیاں اکٹھی کیں اور ان سے میرے سینے میں چوک دیتے ہوئے فرمایا: وابصہؓ، اپنے دل سے پوچھو! اپنے نفس سے پوچھو! تین مرتبہ فرمایا۔ آپ نے فرمایا نیکی وہ ہے جس پر تمھارا نفس مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو نفس میں خلش پیدا کرے اور سینے میں تردد پیدا کر دے۔ اگرچہ لوگ آپ کو فتویٰ دے دیں، (لیکن نفس میں خلش اور تردد ہو تو لوگوں کے فتوؤں کو نہ دیکھو، دل کے فتوے پر عمل کرو)۔ (الفتح الربانی، ج ۱۹)

نبی کریمؐ نے گناہوں سے بچنے والوں کو نیکیوں اور گناہوں کی طول طویل فہرستوں کے بجائے آسان قابل عمل نسخہ بتایا ہے۔ جس دل میں ایمان کی روشنی ہے، خدا کا خوف ہے، جواب دہی کا احساس ہے، اس دل سے اچھا مفتی اور کون ہو سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ مشتبہ امور کو مشتبہ جانتے ہوئے بھی جواز کا فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی مفتی کا نام لے کر پکڑ سے نہیں بچا جا سکے گا۔ نفس مطمئنہ جسے نور فراست حاصل ہو، وہ حق و باطل میں تمیز کر لیتا ہے۔ (ترتیب و تسہیل: مسلم سجاد)

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

قاضی حسین احمد

ایک روایت کے مطابق: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک موقعے پر کہا: "اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود تھے، لیکن ہمیں ان سے آشنا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ حضورؐ کی وجہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت ملی"۔

حضور نبی کریمؐ کو اسی لیے رحمت دوعالم اور محسن انسانیت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ انسانیت کے لیے بے شمار نعمتیں لے کر آئے۔ معرفت الٰہی، اخوت و محبت اور وحدت آدم کا درس لائے۔ رنگ و نسل کے امتیازات ختم کرنے آئے۔ انسانیت کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے تشریف لائے۔ دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کا قرینہ سکھانے اور آخرت میں جنت کے حصول اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بتانے کے لیے تشریف لائے۔ وہ لوگ جنھیں ہدایت ملی، ان پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ احسانات ہیں۔ اسی لیے حضورؐ پر کثرت سے درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ کہا گیا۔۔۔۔ "اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو"۔ آپؐ کے ساتھ محبت ایمان کا تقاضا بتایا گیا۔ آپؐ کی کامل اتباع کو ایمان کے لیے ضروری شرط ٹھہرایا گیا۔ لازم ٹھہرا کہ محض آپؐ سے تعلق خاطر ہی نہ ہو بلکہ عشق و محبت ہو۔ ایسا عشق اور ایسی محبت کہ آپؐ کی ہر ادا محبوب اور ہر طریقہ مطلوب ہو۔ اس لیے کہ سچی محبت ہو تو پھر انسان محبوب کی طرح بننے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے خود اپنے ساتھ محبت کی یوں تعلیم فرمائی:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

یہ محبت دنیا کی عام محبتوں پر یہ فضیلت رکھتی ہے کہ اس کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا، یہ شرط ایمان ہے۔ اس محبت کی بے پناہی اور اس محبوب کی رفعت شان کا کیا ٹھکانا کہ حضورؐ کو خود اللہ رب العالمین

نے اپنے ساتھ محبوب و مطلوب کائنات قرار دیا ہے.....

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (التوبہ ۹:۲۴)

"اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں، اور تمھارے عزیز و اقارب، اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمھارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے، اور تمھارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا"۔

اس آیتِ ربانی میں اللہ کی محبت، رسولؐ اللہ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ یعنی یہ تین محبتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ دراصل یہ تینوں محبتیں ایک ہیں اور ان کی وحدت و یک جائی کے بغیر انسانیت کی وحدت اور امت کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکتی۔ اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی اگر رسولؐ اللہ سے محبت نہ ہو اور رسولؐ اللہ کی محبت کوئی مفہوم نہیں رکھتی اگر جہاد فی سبیل اللہ سے محبت نہیں ـــــ یعنی جہد و عمل سے زندگی گزارنے کی تمنا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیع الشان مرتبہ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ○ (الم نشرح ۹۴:۴)، "اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا" سے واضح کیا۔ اہل ایمان کو آپؐ سے محبت کا قرینہ بھی خود اللہ رب العالمین نے سکھایا۔ ذرا اس رفعت و عظمت کو تصور میں لایئے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (الحجرات ۴۹:۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند آواز میں بات کرنے سے بھی منع کر دیا گیا.....

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِىِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (الحجرات ۴۹:۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارا کیا کرایا

سب غارت ہو جائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو"۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور عاجزی اور نرمی سے بات کرنے والوں کی یوں تحسین کی گئی:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ (الحجرات ۴۹:۳)

"جو لوگ رسولِ خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجرات کے باہر سے پکارنے والوں کو یوں خبردار کیا گیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○ (الحجرات ۴۹:۴)

"اے نبیؐ جو لوگ تمھیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں"۔

حضور نبی کریمؐ کی مجلس کے آداب ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے بھی یہی ہیں کہ حضورؐ کی حدودِ ادب اور حدودِ اطاعت ہمیشہ ملحوظ خاطر رہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھیں، ان کا اتباع اور اطاعت کریں اور جس مجلس میں حضورؐ کا ذکر ہو رہا ہو، ان کی احادیث بیان ہو رہی ہوں، ان کی سیرت بیان کی جا رہی ہو، اس میں بلند آواز سے نہ بولیں، آپؐ کے مبارک قول سے اپنی بات کو زیادہ وقعت نہ دیں اور کوئی کام کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھیں کہ اس سلسلے میں حضورؐ کا مبارک عمل کیا اور کیسا تھا۔ جہاں حضورؐ کا کوئی قول و فعل سامنے آ جائے وہاں اپنے فیصلے کو ترک کر دیں، اپنی مرضی کو چھوڑ دیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○ (النساء ۴:۶۵)

"نہیں، اے محمدؐ" تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں"۔

محبوب کی بات سن کر اس پر سرِ تسلیم خم کرنا تو راحت جاں ہوتا ہے، اس سے دل میں تنگی کہاں ہوتی ہے۔ حضورؐ کی اطاعت سے دل میں تنگی محسوس ہو یا آپؐ کا فیصلہ گراں گزرے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ خام ہے۔ حضورؐ کی محبت ایک بہت بڑا خزینہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو اس خزانے سے بھر دیا ہے۔ اسی عشق و محبت کی وجہ سے امت کی شیرازہ بندی ہوئی اور مسلمان اتحاد کی نعمتوں سے فیض یاب ہوئے۔ مصلحین امت کے لیے آج بھی محبت رسولؐ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ اس کے

ذریعے مسلمانوں کو اتباع و اطاعت رسولؐ کے لیے بلائیں، انھیں ایک لڑی میں پروئیں اور ان کو احساس دلائیں کہ نمائشی محبت کے بجائے اس محبت کے اصل تقاضے کو سمجھیں، یہ جان لیں کہ یہ محبت ہم سے کن قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے؟ خود حضورؐ نے فرمایا: "تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ہر خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے"۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہر خواہش نفس کو ترک کر دو، بلکہ اسے اپنی شریعت کے تابع کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

قرآن آپؐ کی تشریف آوری کو مومنین پر احسان عظیم قرار دیتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران ۳:۱۶۴)

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کو محسوس کرنا چاہیے اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ حضورؐ کا وہ مشن جس کی تکمیل آج بھی ہمارا فرض ہے، یہ تھا کہ حضورؐ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے تھے، مسلمانوں کا تزکیہ کرتے تھے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دین سکھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ان سے کہا تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ کی پہچان کرا دیں، اس کی بندگی سکھا دیں، انھیں آپس میں مل جل کر رہنے کے طریقے سکھا دیں۔ یہ بتا دیں کہ حقوق اللہ کیا ہیں اور حقوق العباد کیا ہیں، اخلاق حسنہ کیا ہیں، اخلاق سیۂ کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے قرآن بھیجا، اس کی تعلیم دی، حکمت بھی سکھائی اور تزکیہ بھی کیا۔ دین کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن اور حضورؐ کا اسوہ حسنہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا: کان خلقه القرآن (وہ قرآن کریم کا چلتا پھرتا نمونہ تھے)۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ ان لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے جو اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح چاہتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کے مدعی ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ ان سے محبت کرے، اللہ ان کو اطاعت رسولؐ کا حکم دیتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱)

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا"۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ○ (الاحزاب ۳۳:۲۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے' ہراس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

بے شک بعثت نبویؐ کا مقصد دین سکھانا' اس کی تعلیم دینا' اخلاق سکھانا اور حکمت سکھانا بھی ہے مگر یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ آپؐ اس دین کو محض سکھانے کے لیے ہی نہیں آئے تھے بلکہ اسے غالب کرنے کے لیے بھی تشریف لائے۔ چنانچہ آج بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اہم ترین تقاضا اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ جو آپؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں' جو آپؐ کی سنت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں' ان کو آپؐ کا ہر انداز محبوب ہونا چاہیے۔ ہر ادا کی پیروی کرنی چاہیے۔ آپؐ معلّم و مربّی اور مزکّی بھی ہیں اور فاتح و سالار بھی' مجاہد بھی اور شہادت کے آرزومند بھی۔ آپؐ جس دین کو سکھانے کے لیے تشریف لائے تھے' اسے دنیا میں غالب کرنے کے لیے بھی تشریف لائے تھے اور اس کی خاطر آپؐ نے پتھر بھی کھائے اور آپؐ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝
(الفتح ۴۸:۲۸)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے محض اس بات کی تصدیق نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی نے حق کے ساتھ بھیجا ہے' بلکہ اس بات کے لیے بھی اپنی گواہی پیش کی ہے کہ آپؐ نے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا ہے کہ اللہ کا دین' دنیا میں غالب ہونے اور غالب رہنے کے لیے آیا ہے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے نام لیواؤں کا فرض ہے کہ اس دین کو دوسرے نظاموں اور مذاہب پر غالب کردیں اور جب تک یہ غالب نہیں ہو جاتا' چین سے نہ بیٹھیں۔ اللہ کے دین کی حقانیت ثابت کرنے اور اسے دنیا کا غالب نظام بنانے کے طریقے بھی سکھائے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نام لیوا کو آپؐ کے طریق کار پر چلنا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کے طے کردہ طریقوں یا اپنے پسندیدہ طریقوں کے بجائے اللہ کے طریقے کی دعوت دیں---- جو لوگ تمھاری طرف آئیں---- جو لوگ اللہ کے دین کے سپاہی بنیں' اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کریں' ان کا تزکیہ کریں' ان کے اندر صبرو اطاعت کا جذبہ پیدا کریں' ان کے اندر مشاورت کی اہمیت پیدا کریں' پھر انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے کر ان کی تنظیم کریں اور پھر اس پوری جماعت کو اظہار دین کے کام پر لگادیں' تاکہ اقامت دین اور غلبہ دین ہو سکے۔ حضورؐ نے عملاً پوری جماعت کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام پر لگا

کر دکھا دیا۔ اب یہ حضورؐ کی امت کا فریضہ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰)

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

اس طرح مختلف آیات اور مختلف طریقوں سے یہ سمجھایا اور بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے کہ تم سب اللہ سے جڑ جاؤ' اللہ کی اطاعت کرو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو' تمھیں ایک بڑے فریضے کی انجام دہی کے لیے منتخب کیا گیا ہے' تمھیں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے کام کرنے کے لیے چنا گیا ہے۔ یہ کام سخت جاں فشانی مانگتا ہے' جان و مال کی قربانی چاہتا ہے' یہ پھولوں کا نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (الحج ۲۲:۷۸)

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ' اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)۔ تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمھارا مولیٰ' بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

حضورؐ نے ایک امت بنائی' اسے تعلیم و تربیت سے اس قابل کیا کہ ساری دنیا کے لیے ہدایت کا نمونہ بن سکے۔ اس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری امت پر گواہ بنا کر بھیجا گیا۔ امت کو بھی اسی طریقے پر کام کرنا چاہیے۔ انھیں دنیا کی تمام قوموں کے لیے داعی اور نمونہ بنایا گیا ہے' قیامت کے دن امت مسلمہ اقوام عالم پر گواہ ہوگی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حرا سے نکل کر لوگوں کی طرف آئے۔ وہ لوگوں میں آنے کے بعد حرا کی طرف نہیں گئے۔ خلوت سے داعی اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کو مجاہدے اور ریاضت سے پختہ کر دیتا ہے۔ پھر جلوت کی طرف آتا ہے اور لوگوں کو اس حسن حقیقی کا مشاہدہ کراتا ہے جس کو خود دیکھ چکا ہوتا ہے۔ حضورؐ کو حرا میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے عشق و محبت اور معرفت کی جو دولت ملی' اسے انھوں نے اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ لوگوں کو بھی اس میں شریک کیا۔

سب سے پہلے قریبی لوگوں تک رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانے کا حکم ملا۔ وانذر عشیرتک الاقربین ○ (الشعراء ۲۶:۲۱۴)' "اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈراؤ"۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سب سے پہلی خاتون تھیں جنھیں اس ہدایت کی روشنی سے اکتساب کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ پہلے اپنے گھروں کی طرف توجہ دیں۔ خواتین کو ساتھ ملائے بغیر ہم حضورؐ کی کامل اتباع کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر دعوت و تبلیغ سے ہم خواتین کو محروم رکھیں گے تو حضورؐ کی کامل اتباع کا تصور نامکمل رہے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں خواتین سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ خواتین کو دین کی تعلیم سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ حضورؐ اور صحابہ کرام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی ازواج کو دعوت اور تعلیم دیتے تھے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)' "اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ"۔

اپنے گھر کے بعد آپؐ جس شخصیت کی طرف متوجہ ہوئے وہ آپؐ کے جگری دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ہدایت' خیرخواہی اور صحیح راستے کی طرف رہنمائی پر سب سے پہلے اپنے گھر والوں' ہمسایوں اور دوستوں کا حق ہے۔ لوگوں کے لیے سکول بنوانا' ہسپتال بنوانا' سڑکیں اور کنوئیں کھدوانا' یہ سب بھی خدمت خلق کے طریقے ہیں' لیکن ان میں سب سے اولیٰ اور اعلیٰ خدمت یہ ہے کہ آپ کسی کو گمراہی کے راستے سے ہٹا کر ہدایت پر لے آئیں۔ اسے دین کی تعلیم دیں۔ اسے بتائیں کہ اللہ کے حقوق کیا ہیں اور بندوں کے حقوق کیا ہیں۔ پھر جس طرح حضورؐ نے اپنے اخلاق حسنہ سے لوگوں کو متاثر کیا' ہم بھی اسی طرح اپنے اخلاق کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارا اپنا عمل اچھا نہیں ہو گا تو ہماری زبان میں اثر بھی نہیں ہو گا۔ حضورؐ کی بنیادی تعلیم سے یہ بھی واضح ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو اپنے اخلاق میں پیدا کرے۔ خود حضورؐ کے اخلاق پر بھی اللہ رب العالمین کے اخلاق کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اللہ عادل ہے' حضورؐ بھی عدل کرنے والے تھے۔ اللہ رحیم ہے' حضورؐ کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود رؤف و رحیم کہا۔ ظاہر ہے خالق اور مخلوق کی تمام چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں' مگر بندوں کو اللہ کی صفات کا پرتو اپنے اخلاق و اعمال میں لانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جو پیغام لے کر تشریف لائے' وہ کسی ایک فرد یا ایک گروہ پر نہیں' پوری امت پر فرض ہے تاہم کم از کم ایک گروہ ہر وقت ایسا رہنا چاہیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران ۳:۱۰۴)

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے"۔

قیامت تک مسلمانوں پر حق کی طرف دعوت دینے اور برائی سے روکنے کا یہ فرض باقی رہے گا۔ یہ فرض کسی خاص دور تک محدود نہیں۔ جس طرح اللہ نے ساری زمین کو حضورؐ اور آپؐ کی امت کے لیے مسجد قرار دیا ہے' اسی طرح آپؐ پوری انسانیت کے لیے رحمت بنائے گئے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وسیع اور بے کراں قافلے کے سالار ہیں اور کعبہ اس کا مرکز ہے۔ یہ امت نہ کوئی جغرافیائی حدود رکھتی ہے نہ یہ وقت کی مقید ہے۔ یہ دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ امت مسلمہ حضورؐ کے پیغام کو ہر زمانے اور ہر علاقے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ حضور نبی کریمؐ کے ذریعے انسانیت تک پہنچائے گئے اس نور ہدایت کی تکمیل کرے گا اور اسی نے ابد تک اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا ہے:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ۝ (التوبۃ ۹:۳۲)

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے' خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے۔

تا خدا ان یطفؤا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

یہ اس نور ہدایت کا اعجاز ہے کہ یہ کفر کی طرف سے ڈالی جانے والی رکاوٹوں سے بے نیاز ہر لحظہ پھیلتا ہی رہتا ہے۔ آج بھی جب کہ اسلام اور مسلمانوں کو عالم کفر کی طرف سے بے پناہ مشکلات کا سامنا ہے' اللہ کا دین اقصائے عالم میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مشرق میں جاپان سے لے کر مغرب میں کینیڈا اور امریکہ تک انسانیت کے اندر اس کی پیاس بڑھ رہی ہے۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کو ایک عالمی بستی (global village) بنا دیا ہے۔ اس عالم گیر بستی کو ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو ساری انسانیت کے لیے عدل و انصاف کا ضامن ہو---- جو رحمت و محبت کا نظام ہو۔ انسانیت سن لے' دیکھ لے اور مان لے کہ صرف حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام ہی دنیا کو امن و سکون اور محبت و رحمت کا پیغام دے سکتا ہے۔ حضورؐ کے دامن عاطفت میں آکر ہی انسانیت کو فلاح مل سکتی ہے۔ موجودہ اضطراب سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

کل تک عالمی طاقتیں یہ دعوے کرتی تھیں کہ انھوں نے ساری طاقت حاصل کر لی ہے۔ سرد جنگ اور گرم جنگ کا خاتمہ ہونے کے بعد امریکہ نے دعویٰ کیا ہم دنیا کو انصاف اور مساوات کا نیا نظام (New World Order) دیں گے، مگر چند ہی برسوں کے بعد اب وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں۔ بھارت نے ایک دھماکہ کر کے ان کے سارے "ورلڈ آرڈر" کو ڈسٹرب کر دیا۔ اس عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے پاکستان نے دھماکہ کرنا چاہا تو ساری دنیا واویلا کرنے لگی کہ پاکستان دھماکہ نہ کرے۔ دراصل پاکستان سے انھیں زیادہ خطرات ہیں، اس سے ان کی مرضی کے نظام کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے کہ پاکستان مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا علم بردار ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیادیں کچی ہیں جبکہ اسلامی تہذیب کی بنیاد ابدی حقائق پر رکھی گئی ہے۔ اس میں نئے سرے سے ابھرنے اور نئی کونپلیں لگانے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کے احیا کے آثار پورے عالم میں صاف نظر آ رہے ہیں۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو دھماکہ کرنے کی توفیق عطا کر دی ہے تو مغربی تہذیب کے علم برداروں کے سارے خیالاتی محلات ٹوٹ کر رہ گئے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ موجودہ جبر اور فساد کی قوتیں انسانیت کو چین اور سکون نہیں دے سکتیں۔ صرف حضورؐ کی تعلیمات کے ذریعے انسانیت کو سکھ اور چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اب ہمیں دنیا کو یہ بتانا ہے کہ آؤ سب ہمارے حضورؐ کے دامن محبت میں پناہ لے لو۔ ان کی تعلیم سے اپنے دلوں کا زنگ اتارو۔ تم دنیا کو نفرت اور تعصب سے نجات نہیں دلا سکتے، اس لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے اکتساب فیض کرو جہاں پوری انسانیت ایک وحدت اور ایک خاندان کی طرح ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی زبان حق ترجمان سے کہلوایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

"اے معشر انسانیت میں تم سب کے لیے اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔

یہ حضورؐ ہی ہیں جنھوں نے فرمایا کہ میں نے تمام جاہلی تفاخر کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل نہیں۔ سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اپنی حیثیت کو پہچانو اور آپس میں مل جل کر رہو۔ آپؐ کی تعلیم کہتی ہے، كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا، "اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ"۔ یہ پیغام یورپ، امریکہ اور افریقہ سمیت ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ اغیار نے اس کا چہرہ بگاڑنے کے لیے اسے انتہاپسند، دہشت گرد قرار دیا اور اس پر تنگ نظری کے الزامات عاید کیے ہیں۔ اس گمراہ کن تاثر کو ختم کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی ہو گی۔ حضورؐ کی زندگی کا نمونہ ہمارے پاس ہے۔ اس کے ذریعے ہم اس تصور اور تاثر کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ حضورؐ نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا تھا جنھوں نے انھیں ستایا تھا۔

انھوں نے ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے کہ برائی کے بدلے برائی سے پیش نہ آئیں' بلکہ اچھائی سے پیش آئیں۔ یہ قرآن کا اصول ہے کہ صرف اچھائیاں ہی برائیوں کو ختم کر سکتی ہیں:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم السجدہ ۴۱:۳۴)

"اور اے نبیؐ" نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے"۔

حکمت یہی ہے' اپنا ہو یا پرایا سب کو دل میں جگہ دینا' سب کو سینے سے لگانا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو سب کے لیے آسان بنا کر پیش کرنا' زیادہ سخت نہ بنانا ـــــ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا (آسان کرو' مشکل نہ بناؤ)' بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا (خوش خبری سناؤ' نفرت نہ دلاؤ)۔ دین کی حکمت یہ ہے کہ اس کو بالکل سہل اور آسان بنا کر پیش کیا جائے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مل کر اور جڑ کر رہنا چاہیے ـــــ رحیم و شفیق بن کر تاکہ دنیا ان کے اخلاق سے متاثر ہو۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ـــ (الفتح ۴۸:۲۹)

"محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں' وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔

کفار پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی کوئی کافر نظر آئے' اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیا جائے یا ان کے ساتھ ترش روئی سے پیش آیا جائے۔ کفار سے بھی حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ حکم یہ ہے کہ کفر کے خلاف اپنے موقف میں سخت اور اٹل ہونا چاہیے۔ کفار کیسا بھی سخت دباؤ ڈالیں اہل ایمان حق پر ڈٹ جائیں اور باطل اور حق میں مفاہمت سے انکار کر دیں۔ ان سے سختی سے پیش آنا ضروری نہیں۔ فرقہ وارانہ اختلافات اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ آپس میں تو ہمیں شیر و شکر ہونا چاہیے۔ مشترک بنیادوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نسلی اور لسانی بنیادوں پر منافرت پیدا کرنا امت کو قوت سے محروم کرنے اور اتحاد امت کی جڑ کاٹنے والی بات ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اخوت اسلامی کو "نعمت" سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا گیا "تم نفرتوں کی آگ کے گڑھے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے اپنی مہربانی سے تمھیں بچا لیا اور ـــــ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران ۳:۱۰۳) (پھر تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے)۔ کیسی بدقسمتی ہے کہ ہم آج اسی جاہلیت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ رحمت عالمؐ پر ایمان رکھنے اور آپؐ سے محبت کے دعوے کرنے والے' ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس نفرت کو ختم کرنے کے لیے دنیا بھر میں اسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے گرد اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام گروہوں کو پھر سے شیر و شکر کر دے گا' ان کو نفرت کی آگ میں جلنے سے بچائے گا اور اپنی نعمت خاص سے انھیں پھر سے بھائی بھائی بنا دے گا۔ دشمنان اسلام کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے دامان رسالتؐ سے وابستگی ضروری ہے۔ ہر دور کی طرح آج بھی سیرت رسولؐ کا پیغام یہی ہے کہ شمع رسالتؐ کے پروانے رنگ و نسل اور نام و نسب کے سب بت توڑ دیں اور دین حق کی سربلندی کے لیے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

مغربی میڈیا کی کوشش ہے کہ پاکستان کے بم دھماکے کو "اسلامی بم" کے نام سے مشہور کروا کر ایک طرف اسلام کو (جس کے لغوی معنی امن و آشتی ہیں) بم کے نام سے وابستہ کر کے اس کے مفہوم کو بگاڑ دیا جائے اور دوسری طرف پوری غیر مسلم دنیا کو اس کے خلاف متحد کر دیا جائے حالانکہ اگر امریکہ اور یورپ کے بم "کرسچین بم" نہیں ہیں تو پاکستان کے بم کو کیونکر "اسلامی بم" کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی اس سازش کو سمجھا جائے کہ وہ حضور رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام رحمت کو انسانیت کی نظروں سے چھپانے کے لیے پراپیگنڈے کا گرد و غبار اڑا رہا ہے کہ کہیں انسانیت اس دور کے تقاضوں کو سمجھ کر حضورؐ کے دامن رحمت میں پناہ لینے کے لیے نہ دوڑ پڑے۔ مغرب کا یہ مطالبہ کہ صرف پانچ قوموں تک ایٹمی توانائی کو محدود رکھا جائے؟ ایک سراسر ناجائز مطالبہ ہے۔ اگر واقعی ایٹمی ہتھیار اور دوسرے تباہ کن ہتھیاروں سے انسانیت کو محفوظ رکھنا ہے تو پانچ بڑی طاقتوں سمیت دنیا کی تمام اقوام تخفیف اسلحہ کے ایک معاہدے پر متفق ہو جائیں۔ بھارت نے مغربی اقوام کے دباؤ کے باوجود یہی موقف اختیار کیا ہے' پاکستان کو بھی اسی اصولی موقف پر ڈٹ جانا چاہیے۔

اگر پوری دنیا میں طاقت کی زبان کے بجائے دلیل کی زبان رائج ہو جائے تو اسلام کی حقانیت لوگوں پر واضح ہو جائے گی۔ مستقبل میں ان شاء اللہ اسلام' قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کے عام ہونے کے نتیجے میں' غالب ہو گا۔ یہ اکیسویں صدی کے گلوبل ولیج (عالمی بستی) کی ضرورت ہے۔

توحید کا اعلان

بادلوں کی گرج
یہ ظاہر کرتی ہے کہ
جس خدا نے

یہ ہوائیں چلائیں یہ بھاپیں اٹھائیں یہ کثیف بادل جمع کیے' اس بجلی کو بارش کا ذریعہ بنایا اور اس طرح زمین کی مخلوقات کے لیے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا۔

وہ سبوح و قدوس ہے' اپنی حکمت و قدرت میں کامل ہے'
اپنی صفات میں بے عیب ہے' اور اپنی خدائی میں لاشریک ہے۔

جانوروں کی طرح سننے والے
ان بادلوں میں صرف گرج کی آواز سنتے ہیں

مگر جو ہوش کے کان رکھتے ہیں' وہ
بادلوں کی زبان سے
توحید کا یہ اعلان سنتے ہیں

(تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۲۱۶)

(خیر جولی)

جنت کے سودے

شاہ بلیغ الدین

حضور اکرمؐ تلاوت کلام اللہ میں مصروف تھے۔ صحابہ کرامؓ بھی ادھر ادھر بیٹھے عبادت اور ذکر الٰہی میں لگے تھے کہ حضرت مالک بن ثعلبہؓ آئے۔ مالکؓ مالدار آدمی تھے۔ بڑے آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مالکؓ حضور اکرمؐ کے قریب پہنچے تو کلام اللہ کی جو آیت ان کے کان میں پڑی' اس کا مطلب ہے: جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' ان کو سخت عذاب کی خبر سنا دو۔ مالکؓ نے یہ آیت سنی تو ان پر خوف طاری ہوا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئے' لیکن بیٹھا نہ گیا۔ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ اسد الغابہ میں ہے' خوف نے اس قدر غلبہ پایا' کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے' کچھ طبیعت سنبھلی' دل و دماغ پر قابو پایا تو حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں' کیا یہ آیت ان لوگوں کے لیے اتری ہے جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں؟ ارشاد ہوا' ہاں!

مالکؓ سمجھ دار آدمی تھے۔ دور اندیش تھے۔ روپے پیسے کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ دنیا اور دنیا کے تقاضوں پر نظر تھی لیکن ساتھ ہی خدا نے ایمان بھی دیا تھا۔ اللہ کے رسولؐ سے محبت بھی تھی اور قرآن کے کہے پر چلنے کی تڑپ بھی۔ مالکؓ ایک کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ کبھی نفس انگڑائیاں لیتا' کبھی ضمیر چٹکی بھرتا۔ سوچتے رہے' سوچتے رہے۔ محسوس ہوا' جیسے وہ اپنی دولت کے انبار میں دھنسے جا رہے ہوں۔ اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھتا محسوس ہوا۔ ذہن نے کہا: افسوس! آدمی کس درجہ اپنی دولت پر بھروسا کرنے لگتا ہے کہ اپنے دست و بازو اور عقل کی قوت پر بھی بھروسا باقی نہیں رہتا۔ مالکؓ نے اپنے دل سے کہا: تف ہے ایسی بے بسی پر! اللہ پاک چاہتا کیا ہے؟ یہی نا کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اور میں نے درہم و دینار جوڑ رکھے ہیں۔ انھیں گنتا رہتا ہوں اور ان کی الٹ پھیر میں دیوانہ ہوں۔ افسوس مال کی محبت نے میرا دل بھی سخت کر دیا۔ آخر مالکؓ نے دل میں ٹھان لی کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

گھر پہنچے' غریبوں' محتاجوں' مسکینوں کو بلایا اور صدقے کا سلسلہ شروع کیا۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی بات تھی۔ عذاب خداوندی سے ڈر لگتا تھا جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ شام ہوتے ہوتے مالکؓ نے سب کچھ بانٹ دیا۔ ساری دولت خدا کی راہ میں دے دی۔ ابن اثیر لکھتے ہیں: حضور اکرمؐ کے پاس سے اٹھے تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ --- شام ہونے تک مالکؓ کے پاس ایک دینار اور ایک درہم نہ ہو گا۔ مالکؓ نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ خدا کے رسولؐ سے وعدہ جو تھا! اب کوئی انھیں دیکھتا۔ خوشی سے چہرہ چمک اٹھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا' دونوں جہاں کی دولت ان ہی کو مل گئی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے' حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ ابن آدم میرا مال' میرا مال کہتا رہتا ہے۔ مال ہے کیا؟ جو وہ کھا کر ختم کر دے' پہن کر پھاڑ دے یا راہ خدا میں دے کر باقی رکھے۔ مسلم میں کچھ اور توضیح آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان تینوں صورتوں کے بعد جو کچھ بچ رہے' وہ اس کا کہاں' وہ تو ابن آدم دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ بخاری میں ہے' فرمایا اللہ کے نبیؐ نے' کہ تین چیزیں میت کے ساتھ جاتی ہیں: مال' اہل و عیال اور اعمال۔ دو چیزیں لوٹ آتی ہیں: مال اور اہل و عیال' صرف اعمال ساتھ رہ جاتے ہیں۔ اعمال میں اللہ کا پسندیدہ عمل یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو بانٹ کر کھایا جائے۔

صحابہ کرامؓ ایک سے ایک بڑھ کر خدا ترس اور مسکینوں کا خیال رکھنے والے تھے۔ بخاری ہی میں ہے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ کسی غریب کی شرکت کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ ایک بار انھیں مچھلی کھانے کی خواہش ہوئی۔ حضرت صفیہؓ آپ کی شریک حیات تھیں۔ سنا شوہر کی خواہش ہے تو فوراً مچھلی منگوائی۔ مدتوں میں یہ دن دیکھنے کا موقع آیا تھا کہ ابن عمرؓ کھانے کی کسی چیز کے لیے خواہش کرتے۔ بیوی نے بڑی محنت سے مچھلی پکائی۔ کھانا نکلا۔ شوہر ساتھ آبیٹھے۔ عادت تھی کہ اکیلے نہ کھاتے۔ معمول تھا کہ کوئی چیز پسند آتی تو خدا کی راہ میں صدقہ دے دیتے۔ گرم گرم سالن سامنے تھا۔ خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں کہ ایک مسکین کی آواز آئی۔ ابن عمرؓ تو تھے ہی اسی انتظار میں۔ اٹھے' مچھلی لی' چاہتے تھے مسکین کے حوالے کر دیں کہ شریک حیات ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھیں' لیکن کیا کہتیں' کس بات سے روکتیں' کیسے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیتیں کہ خدا کی راہ میں نہ دو! یہ بھی چاہتی تھیں کہ شوہر نے اتنی خواہش سے پکوایا ہے تو کچھ تو چکھیں۔ نیک بی بی تھیں' اٹھیں' ایک دینار نکالا' سائل کو دیا۔ مچھلی شوہر کی طرف بڑھائی۔ ابن عمرؓ نے دیکھا سائل خوش خوش گیا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور مچھلی کھائی۔ ادھر حضرت صفیہؓ کو اپنی محنت کی داد مل گئی۔

ایک مرتبہ ابن عمرؓ بیمار پڑے۔ ان کے لیے انگور خریدے گئے۔ درہم میں پانچ انگور آئے تھے۔ ابن عمرؓ نے دیکھا' بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں دیکھا سامنے سے ایک سائل چلا آ رہا ہے اور بھی خوش ہو گئے۔ وہ انگور اٹھا کر اس کے حوالے کر دیے۔ پسند کی چیز' اللہ کی راہ میں دے دینا بڑا کام ہے۔ صحابہ کرامؓ یہی کرتے

تھے۔ یہ نہیں کہ فرض پورا کرنے کے لیے بچا کھچا' جھوٹا کھوٹا دے دیا کرتے۔ چنانچہ بیمار ابن عمرؓ نے خواہش پر منگوائے ہوئے انگور سائل کو دینا چاہے تو لوگوں نے بہت روکا لیکن آپ نہ مانے۔ بعد میں اس سے سودا کیا گیا اور وہ انگور معاوضہ دے کر اس سے واپس لیے گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان لوگوں میں سے تھے جو زکوٰۃ و خیرات کی آیتوں کو خوب سمجھتے تھے اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ حضور اکرمؐ زکوٰۃ' صدقات اور خیرات کے لیے کیسی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ خود بھوکے رہتے اور منہ کا لقمہ تک اٹھا کر دوسروں کو دے دیتے۔ صحابہ کرام تو تھے ہی اسوۂ حسنہؐ کے متوالے' ایک ایک سنت کی اتباع کرنے کی کوشش کرتے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ کا مطلب ہے: لوگو! جب تک خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے جو تم کو بہت پسند ہیں' نیکی کے درجے کو ہرگز نہ پہنچ سکو گے۔

ابن عمرؓ کے ایک خدمت گار تھے نافع۔ طبقات میں ان کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ ہے۔ نافع کہتے ہیں' ایک بار بیس ہزار درہم ان کے پاس آئے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے' فوراً بیٹھ گئے۔ ایک ایک درہم تقسیم کر کے اٹھے۔ حضور اکرمؐ ڈھیروں رقمیں جو غنیمت اور خراج میں آتیں' مسجد نبویؐ کے صحن میں رکھوا دیتے اور اس وقت تک بے چین رہتے' جب تک ایک ایک درہم تقسیم نہ ہو جاتا۔ آپؐ کی پیروی' ابن عمرؓ اپنا ایمان سمجھتے تھے۔

نافع کہتے ہیں' جب بیس ہزار درہم تقسیم کر دیے تو اس وقت کچھ لوگ آئے۔ یہ بھی سائل تھے۔ اب ان کو کہاں سے دیتے۔ گھر میں بھی کچھ نہ تھا۔ اللہ اللہ کیا دل پایا تھا کہ سائلوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ نافع کہتے ہیں' جن لوگوں کو ہاتھ بھر بھر کر دیا تھا' انھی میں سے ایک دو سے کچھ رقم قرض لی اور ان سائلوں کے حوالے کی۔ نافع کہتے ہیں' میں نے دیکھا اب ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ ایسے ہی خدا ترس' بے ریا' نیک نفس بندوں کے بارے میں قرآن میں آیا کہ--- یہ اللہ کو قرض دینے والے صاحب ایمان ہیں۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً (البقرہ ۲:۲۴۵) کوئی ہے جو یہ سمجھ کر کہ میں خدا کو قرض دے رہا ہوں' نیک کاموں میں اپنا مال خرچ کرے اور پھر خدا اس کے مال کو اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے۔

(زیر اشاعت کتاب' بزم الف لام میم کا ایک باب)

قرآن کوئز

۱- کیا آپ قرآن پڑھ سکتے ہیں

۲- کیا آپ کے گھر میں قرآن پاک کا آسان ترجمہ موجود ہے

۳- کیا آپ نماز کے دوران قرآن کی تلاوت سمجھ سکتے ہیں

۴- کیا آپ نے گھر والوں کو قرآن پڑھانے اور سمجھانے کا کوئی بندوبست کیا ہے

۵- کیا آپ کے بچوں کو سکول میں قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے

۶- کیا آپ قرآن سمجھنے کے لیے آڈیو، وڈیو یا کمپیوٹر سے مدد لیتے ہیں

۷- کیا آپ کے گھر والوں میں سے کوئی قرآن فہمی کے کسی ادارے سے فائدہ اٹھاتا ہے

۸- کیا آپ نے قرآن سمجھنے کے لیے کبھی کسی پروگرام میں جانے کا ارادہ کیا ہے

۹- کیا آپ قرآن کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں

۱۰- کیا اللہ کے پیغام کو سمجھنے کے لیے وقت صرف کرنے کا کوئی فائدہ ہے

اور یقیناً یقیناً ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی سمجھنے والا

(القرآن)

قرآن فہمی پراجیکٹ

۲/۹ جیل روڈ - گلبرگ ۵ لاہور

فون: ۵۷۵۷۴۷۴-۵۷۵۷۲۷۲

تحریک اسلامی: زوال سے بچاؤ کی تدابیر

صدر الدین اصلاحی

جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام رام پور میں ۹ ستمبر ۱۹۹۶ کو "تحریک اسلامی کو زوال سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں" کے موضوع پر ایک سیمی نار منعقد ہوا تھا۔ اس میں جماعت کے مرکزی رہنماؤں نے حصہ لیا تھا۔ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب بذات خود اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے' البتہ اس موضوع پر انھوں نے ایک جامع تحریر بھجوادی تھی جسے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

میرے جائزے کے مطابق کسی اسلامی تحریک کو زوال سے محفوظ رکھنے کی مختصر تدبیریں حسب ذیل ہیں:

۱۔ **مقصد تحریک کو تازہ رکھنے کی پیہم جدوجہد:** سب سے اہم اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں کے دل و دماغ میں اس کی بنیاد کو مضبوط اور ہر آن توانا رکھنے کی پیہم جدوجہد جاری رکھی جائے۔ کیونکہ تحریک کے اصل نصب العین کے بارے میں کارکنوں کے ذہن میں جو گہری وابستگی اور یک سوئی ابتدا میں ہوتی ہے' ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وابستگی داخل اور خارج دونوں ہی کی بہت سی مخالف قوتوں کی زد میں رہا کرتی ہے' مثلاً ہمت شکن سیاسی حالات اور معاشی دشواریاں' ماحول کی اجنبیت' دوسرے مسلم گروہوں اور افراد کے افکار سے اثر پذیری اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے اسباب کے تحت اقامت دین کے نصب العین کے یقین و اذعان میں جو کچھ زنگ پیدا ہو' اسے پوری مستعدی اور ہوش مندی سے برابر صاف کیا جاتا رہے۔ ورنہ قرآن کی روزانہ تلاوت کرتے رہنے اور اس کی عظمت و تقدیس کی کیفیت جسم پر طاری کرتے رہنے کے باوجود جس طرح اس کا حق اتباع ادا کرنے کا خیال لوگوں کے دل میں بہ مشکل ہی آیا کرتا ہے' اسی طرح قطعی ممکن ہے کہ لوگ تحریک اسلامی سے وابستہ رہتے ہوئے اور اقامت دین کے نصب العین کو اپنا فریضہ حیات قرار دیتے ہوئے بھی غیر شعوری طور پر عملاً اس سے دور جا پڑیں۔

۲۔ **رضاے الٰہی کی طلب ماند نہ پڑے:** دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کارکنوں کے اندر خالص

رضائے الٰہی کی طلب نہ صرف یہ کہ برقرار رکھی جائے بلکہ اسے فزوں تر بنانے کا اہتمام رکھا جائے۔ کیونکہ ایک بار ابتدا میں پورے اخلاص کے ساتھ یہ عزم و اقرار کر لینا کہ اللہ کی رضا طلبی ہی ہمارا پہلا اور آخری مقصد ہے اور ہم صرف اس کی خاطر اس تحریک میں شامل ہوئے ہیں' اس بات کی ہرگز کوئی ضمانت نہیں کہ ایک دن کا یہ فیصلہ ہمیشہ اسی اخلاص و عزیمت کے ساتھ برقرار رہے گا۔ ایمان و اسلام کی پوری تاریخ اس خوش گمانی کی تردید کر رہی ہے اور رضائے الٰہی کے جذبے کا کمزور پڑ جانا تحریک کو قطعاً جسد بے روح بنا دیتا ہے۔

۳- **باطل نظام اور افکار و نظریات سے مداہنت کا خدشہ:** تیسری ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے علم برداروں کے اندر باطل نظام' افکار و نظریات سے سازگاری اور مداہنت کی بیماری نہ گھسنے پائے اور وہ اس طرف سے پوری طرح چوکنے رہیں۔ کھلی بات ہے کہ صاحب اقتدار باطل فطری طور پر اور مختلف جہتوں سے' اہل حق کے ذہنوں پر مرعوبیت طاری کرنے کی کوشش میں رہتا ہی ہے۔ اس لیے اگر تحریک اس کی ان کوششوں کو سختی اور استقلال کے ساتھ ناکام بنانے کی طرف متوجہ نہیں رہے گی تو وہ اس سے سازگاری پیدا کرنے کے خطرے سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ سازگاری کا یہ میلان' تحریک کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔

۴- **حکمت و دانش کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا:** چوتھی بات یہ کہ تحریک کو جہاں مداہنت کے رجحان سے محفوظ رکھا جائے وہیں اسے بدتدبیری' بے حکمتی اور فتور سے بھی بچایا جائے اور حکمت و دانش کے تقاضوں کو ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ ہر تحریک کی طرح اسلامی تحریک بھی ایک تدریج سے قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اگر اس تدریج کو پس پشت ڈال دیا جائے اور پہلے ہی قدم پر ہر طرح کے محاذ کھول دیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ سرکش گھوڑے کی طرح تحریک کی گاڑی کو لے جا کر کسی گڑھے میں ڈال دیا جائے۔

۵- **دین کے غیر متوازن تصور سے بچاؤ:** پانچویں بات یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں میں دین کا صحیح اور متوازن تصور' عدم توازن سے نہ بدلنے پائے۔ اس بات کی پوری نگرانی رکھی جائے کہ ان کے ذہنوں میں دین کی ہر ہدایت اور اس کے ہر مطالبے کو وہی حیثیت حاصل رہے' فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی' جو قرآن و سنت میں فی الواقع اس کی ہے۔ اس عدم توازن کا خطرہ جس بنا پر ایک واقعی خطرہ ہوتا ہے' وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کا وہ شدید ردعمل ہے جو دوسرے مسلمانوں کے ناقص اور غیر متوازن تصورات دین کے خلاف ان کے اندر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ جب تک یہ ردعمل معقول حدود کے اندر رہتا ہے تو خیر کا موجب بنتا ہے لیکن جب وہ شدت اور بحران کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس سے شر پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایک بہت

واضح مثال لیجیے۔ دین کا وہ تصور جو معروف عبادات سے آگے نہیں جاتا، قطعی طور پر ایک ناقص تصور ہے۔ وہ دین کو انسانی زندگی کے عظیم اجتماعی کردار سے بے تعلق رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے احکام کا ایک بڑا حصہ بالکل معطل پڑا رہ جاتا ہے اور انسان کی دینی زندگی اللہ تعالیٰ کی مکمل طاعت و بندگی کی سعادت سے محروم رہ جاتی ہے۔ اب اگر اس ناقص تصور دین کے خلاف کسی اسلامی تحریک کے داعیوں میں اتنا شدید ردعمل پیدا ہو جائے کہ وہ دین کے اجتماعی و سیاسی احکام ہی کو سب کچھ سمجھنے لگیں اور ذکر و تسبیح اور شب بیداری کی کماحقہ اہمیت ان کے اندر کم ہو جائے، حتیٰ کہ وہ اسے خدانخواستہ "خانقاہیت" سے موسوم کرنے پر اتر آئیں، تو یہ ایک بڑا نامبارک اور خطرناک ردعمل ہو گا اور تحریک کی جڑیں ہلا دینے کے لیے بالکل کافی ثابت ہو گا۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔

۶- **کارکنوں میں فکری جمود:** چھٹی بات یہ کہ عام کارکنوں کی عملی سرگرمیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی فکری جولانیوں کو بھی ماند پڑنے سے بچایا جائے۔ تحریک اپنے صحیح رخ پر ہرگز سرگرم سفر نہیں رہ سکتی اگر اس کے عام کارکنوں میں فکری جمود پیدا ہو جائے۔ وہ تحریک کے لیے سوچنا اور فکرمند رہنا چھوڑ دیں۔ اس کے معنی یا تو یہ ہوں گے کہ ان کی دلچسپیوں کا اصل مرکز اس تحریک کے بجائے کوئی اور چیز ہو چکی ہے یا پھر یہ کہ تحریک کے مستقبل کے بارے میں ان کے ولولے سرد پڑ گئے ہیں۔ ان میں سے جو بات بھی ہو، وہ تحریک کے لیے پیام مرگ ہی ثابت ہو سکتی ہے۔

۷- **آزادی فکر و رائے کی صحیح تربیت:** ساتویں ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے خادموں میں اختلاف رائے تو ضرور ہو کہ یہ انسانی قوت فکر و تدبر کا فطری تقاضا ہے۔ مگر یہ اختلاف رائے انتشار فکر اور ذہنی طوائف الملوکی کی شکل ہرگز نہ اختیار کرنے پائے کہ یہ کج فکری اور سوء تدبر کی علامت ہے۔ آزادی فکر و رائے، ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ اس حق کو اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو جماعت میں عمل کی صحت اور اقدام کی قوت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کا استعمال غلط طریقے سے کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی الٹا نکلتا ہے اور جماعت کو منتشر اور بے دم کر کے رکھ دیتا ہے۔ آزادی فکر و رائے کے صحیح استعمال کی شکل یہ ہے کہ غیر منصوص اور اجتہادی امور میں، رایوں کے کسر و انکسار سے کام لیا جائے۔ صحیح بات تک پہنچنے کے لیے کھلے دل سے بحث و گفتگو تو چاہے جتنی بھی ہو، ضرور کی جائے، مگر آخر میں جب کوئی فیصلہ ہو جائے تو پھر اپنی رائے پر اصرار کرنے کا خیال ترک کر دیا جائے۔ اِعْجَابُ کُلِّ ذِیْ رَاْیٍ بِرَاْیِہٖ یعنی رائے والے کا اپنی رائے پر فریفتہ ہو رہنا، ایسی مہلک بیماری ہے جس کی موجودگی میں کسی جماعت کا اپنے مقصد کے لیے سرگرم سفر رہنا تو دور کی بات ہے، اس جماعت کا باقی رہنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

۸- **امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے جذبے کا سرد پڑ جانا:** آٹھویں ضروری بات یہ ہے کہ

تحریک کے کارکنوں میں تواصی بالحق وتواصی بالصبر کا ایمانی ذوق کم نہ ہونے پائے' بلکہ اسے برابر بڑھاتے رہنے کا اہتمام رکھا جائے۔ ورنہ کہنے کو تو یہ اہل ایمان کا ایک ایسا قافلہ ہو گا جس کے افراد کے جسم ہی نہیں' ان کے دل بھی ملے ہوئے ہیں اور جن کے اندر اتباع دین اور استقامت علی الحق کے جذبات موجزن ہیں' مگر فی الواقع ان میں سے کوئی بات نہ ہو گی اور جب یہ باتیں نہ ہوں گی تو تحریک کی کامیابی کا بھی کوئی سوال باقی نہ رہ جائے گا۔

۹- **اطاعت امیر کا صحیح تصور اجاگر کرنے کی ضرورت:** نویں اہم ضرورت یہ ہے کہ تحریک کے عام کارکن اپنے سربراہوں کے ساتھ "نصح" کا فرض پورے احساس فرض کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ معروف میں ان کی پوری پوری اطاعت کریں اور ان کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام کے جذبات رکھیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے لیے فکری اور عملی ہر طرح کی لغزشوں سے بچنے کا ذریعہ بنیں۔

۱۰- **مایوسی یا اکتاہٹ کا سدباب:** دسویں ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے داعی اور کارکن اپنے کام کے سلسلے میں' جسے انھوں نے اپنا فریضہ حیات سمجھ کر قبول کیا ہے' کبھی دل شکستگی' مایوسی یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ انھیں صرف چند روز کی کوششوں کے بعد یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے کہ جس زمین پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں' وہ بنجر ہے اور لوگ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس قسم کی جلد بازی سخت خطرناک چال ہے۔ نفس اور شیطان کی' اس چال کا ہرگز شکار نہ ہونا چاہیے۔ نہ کسی دوسرے ہمراہی کو اس کا شکار بننے دینا چاہیے۔ آخر آدمی یہ کیوں سوچے کہ اس بارے میں سارا قصور مخاطب ہی کا ہے۔ یہ بھی کیوں نہ خیال کرے کہ خود میرے اپنے طریق دعوت میں بھی تو کوئی نقص ہو سکتا ہے' خود میرے اخلاق و اعمال کی شہادت میں بھی تو خامیاں ہی خامیاں ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میری دعوتی کوششوں کا دوسروں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری میں میرا بھی حصہ ضرور ہے۔

۱۱- **کامیابی ناپنے کا پیمانہ:** اس ضمن میں جو اصل بات ہے' وہ یہ ہے کہ داعی کو اپنی کامیابی ناپنے کا پیمانہ' دعوت کی کامیابی اور اس کے پھیلاؤ کو نہ بنانا چاہیے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ نظر اس پر جمی رہنی چاہیے کہ میں اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو تاحد امکان پوری طرح انجام دوں' اس پر نہیں کہ اس کے محسوس نتائج کیا نکلتے ہیں۔ دعوت کے کام میں سستی اور مایوسی پیدا ہی اسی وقت ہوتی ہے جب نظر کا کانٹا اس طرح بدل جاتا ہے۔ تحریک کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے داعیوں میں فکر و نظر کی یہ سلامتی برقرار رہے۔

اخبار امت

مسلم ممالک کے آمر

مسلم سجاد

گذشتہ دنوں عالم اسلام کے' دو سروں پر واقع دو بڑے مسلم ممالک میں دو آمر رخصت ہو گئے۔ انڈونیشیا میں جناب سہارتو' طلبہ اور عوام کے احتجاج کے نتیجے میں ۳۲ سال متمکن رہنے کے بعد' تخت صدارت سے اتار دیے گئے۔ نائیجیریا میں فوجی حکمران ثانی اباچا' ایک صبح مردہ پائے گئے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ طبعی موت آئی یا انھیں زہر دیا گیا ہے۔

دونوں ہی ممالک دور دراز واقع ہیں۔ یہ محاورہ تو بن گیا ہے کہ دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے لیکن اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ مغربی کلچر اور مغربی دنیا کی خبریں روز مرہ ہو گئی ہیں۔ مسلم ممالک کی حد تک تو فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ ہم پاکستان میں تقریباً وسط میں واقع ہیں (زمینی فاصلے تو اب اطلاعات کے تبادلے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے) اور غالباً فخر کر سکتے ہیں کہ شاید ہی کسی مسلم ملک میں پریس کو ہمارے پریس جیسی آزادی حاصل ہو۔ اس لیے خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے اخبارات' مسلم ممالک کے واقعات کو حقیقی اہمیت دیں' مغربی معاشرے کی غیر اہم معمولی خبروں کو محض اس لیے کہ وہ بآسانی دستیاب ہیں' نہ اچھالیں۔ مسلم ممالک میں صرف فوجی انقلاب اور سازشیں ہی نہیں ہوتیں' کروڑوں لوگ مسائل سے دوچار ہیں۔ وہ یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں' ہمارے زیادہ قریب ہونا چاہییں۔ عام انسانی اہمیت کی خبریں' ترقی کی کوششیں' دینی رجحانات' دشمنوں اور سازشوں کا مقابلہ' تفریحات اور کھیل کی حتیٰ کہ جرائم کی خبریں بھی اگر مسلم ممالک کی شائع ہوں تو فاصلے کم ہوں' قربت کا احساس بیدار ہو۔ مختلف میدانوں میں اہم شخصیات کون ہیں' علمی کام کیا ہو رہے ہیں؟ سب کچھ ایک دوسرے کو معلوم ہونا چاہیے۔ اگر تین' چار اہم مراکز میں ہمارے اہم اخبارات کے اپنے نمایندے مقیم ہوں اور ان کی رپورٹیں شائع ہوں تو سی این این' بی بی سی اور وائس آف امریکہ ہمارے لیے سند نہ رہیں۔ ایک مغربی اخبار نے ۳۲ ممالک میں اپنے نمایندے بھیجے ہیں تا کہ وہ بتائیں کہ اس ملک میں فٹ بال کے عالمی مقابلے دیکھنے کی کیا کیفیات ہوتی ہیں۔ ہمارا کوئی اخبار پاکستان

کے ایٹمی دھماکے پر مختلف مسلم ممالک کے عوام کے تاثرات جمع کرتا تو یقیناً اخوت کے رشتے مضبوط ہوتے۔ المجتمع کویت کے مطابق قاہرہ میں پاکستان کے سفیر نے بتایا کہ ان کے فون کی گھنٹی بند نہیں ہو رہی، مبارک باد کا سلسلہ جاری ہے اور بھاری رقوم کے چیک آ رہے ہیں۔ ہمارے بڑے اخبارات کو، امت کے مسائل کو، اتنی اہمیت تو دینا چاہیے۔ ترکی سے خبر آ جائے کہ ڈیڑھ سو فوجی افسران کو اسلامی عناصر سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں برطرف کر دیا گیا ہے تو خبر کے ساتھ ہی تجزیوں اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہو اور معلوم ہو کہ ہم زندہ قوم ہیں، ایسا کیوں نہیں ہوتا۔

نائیجیریا میں، آزادی کے ۳۸ سال میں سے ۲۸ سال فوج نے حکومت کی ہے۔ ابھی مرنے والے فوجی آمر، اباچا نے، نومبر ۹۳، میں اقتدار پر قبضہ کر کے دستور معطل کر دیا اور عام انتخابات میں منتخب ہونے والے صدر مشهود ابیولا کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جہاں وہ ۴ سال سے قید تنہائی میں ہیں۔ اباچا نے ملک کو بدترین پولیس اسٹیٹ بنا کر رکھا۔ اس وقت سات ہزار سے زائد سیاسی کارکن بدترین حالات میں جیلوں میں بند ہیں۔ مرنے والوں کی لاش بھی کئی کئی دن بعد اٹھائی جاتی ہے۔ خفیہ پولیس والے، صحافیوں، وکیلوں، مزدور رہنماؤں جس کو چاہتے ہیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۲ میں غربت ۲۱ فی صد تھی، جو اب ۸۰ فی صد ہے۔ نائیجریا کی اصل دولت تیل ہے اور اس کا سب سے بڑا خریدار امریکہ ہے جس نے پچھلے سال خریداری کو دوگنا کیا ہے۔ تیل کی یہ دولت، ملکی ترقی پر خرچ ہونے کے بجائے حکمرانوں کے بنک اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق اباچا کے اپنے ایک ارب ڈالر جمع ہیں۔ امریکہ انسانی حقوق کا علم بردار بنتا ہے اور پابندیاں لگانے کے لیے بہانے ڈھونڈتا ہے لیکن نائیجریا کی فوجی حکومت کو عملاً اس کی آشیرباد حاصل ہے۔ مشهود ابیولا کی بیٹی حفصہ نے نیوز ویک (۲۲ جون ۹۸) میں لکھا ہے کہ اگر امریکہ نائیجیریا سے تیل خریدنا بند کر دے تو فوجی حکومت پر کچھ دباؤ پڑے، ابھی تو حوصلہ افزائی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جنوری 1995 میں، اُسے اپنے بچوں کے ساتھ، اپنے باپ سے، صرف دس منٹ ملاقات کا موقع دیا گیا۔ اس کی والدہ کو ملنے بھی نہیں دیا گیا۔ جب ابیولا کی بیوی خدیجہ نے اپنے شوہر کے حالات سے عالمی ذرائع ابلاغ کو آگاہ کیا، تو اسے لاگوس کے بازار میں دن دہاڑے قتل کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اباچا کی موت کا اعلان ہوا تو نائیجیریا میں جشن کا سماں ہو گیا۔ لوگوں نے بہت خوشی منائی۔ لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ فوجی کونسل نے میجر جنرل عبدالسلام ابوبکر سے حلف اٹھوا لیا جس نے حسب معمول انتخابات کروانے اور اقتدار منتقل کرنے کا وعدہ دہرا دیا۔

یہی جشن کا سماں، انڈونیشیا میں اس وقت ہوا جب لوگوں کو پتا چلا کہ سہارتو رخصت ہو گئے ہیں۔ انڈونیشیا کی ایک پوری نئی نسل نے سہارتو کے علاوہ کسی کو حکمران نہیں دیکھا۔ اس ۳۲ سال میں نام نہاد ترقی

کے عنوان کے تحت' سہارتو کی آل اولاد اور فوجی جرنیلوں نے خوب دولت کمائی۔ ۴۳ ارب ڈالر کی جو امداد آئی ایم ایف سے ملنے والی تھی' اس سے زیادہ رقم ان کی بینکوں میں جمع ہے۔ عوام منگائی میں پس رہے ہیں۔ انڈونیشیا کے نئے صدر یوسف حبیبی ہیں۔ تبدیلی تحریک کے نتیجے میں' لیکن فوجی جرنیلوں کی مرضی سے ہوئی ہے۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ انڈونیشیا کے عوام کو' اقتدار یا اقتدار میں کچھ حصہ ملتا ہے یا نہیں۔

مصر میں حسنی مبارک' شام میں حافظ الاسد' عراق میں صدام حسین' تیونس میں زین العابدین---- مسلم ممالک پر مسلط یہ حکمران کب اور کیسے جائیں گے؟ یہ عوام کی مرضی کے خلاف مسلط ہیں۔ فوج ان کی پشت پر ہے۔ انتخابات کا ڈھکوسلہ کر کے جمہوریت کا ٹھپہ لگا لیا ہے۔ عوام حقوق سے محروم ہیں۔ یہ ممالک اربوں ڈالر کے مقروض ہیں اور حکمرانوں کے ذاتی اکاؤنٹ میں اربوں ڈالر جمع ہیں۔

یہ صورت حال تیسری دنیا کے کئی ممالک میں ہے لیکن مسلمان ممالک میں بطور خاص ہے' جبکہ اسلام تو آیا ہی اس لیے ہے کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دے۔ ہر ملک میں دینی رجحانات بھی موجود ہیں لیکن اپنوں کی غلامی کے ساتھ سمجھوتہ کر کے۔ اسلامی تحریکیں دین کے حقیقی تصور کی علم بردار ہیں۔ ان کے لیے چیلنج یہی ہے کہ ان ممالک میں' جو انقلاب کے لیے تیار ہیں' انقلاب برپا کر دیں۔ ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی منزل کو قریب لا سکتی ہے۔ اخبارات و رسائل اور میڈیا کو مسلم عوام کو ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اس سے بہت زیادہ جتنا امریکہ اور یورپ کے بارے میں کرتے ہیں۔ اطلاعات پھیلنے سے تاریکی دور ہو گی' رائے عامہ ہموار ہو گی' ظلم پر احتجاج ہوں گے' آمروں کو دھچکا لگے گا' مقابلہ کرنے والوں کو حوصلہ اور عزم ملے گا۔ یہ بیداری انقلاب کا نقطہ آغاز ثابت ہو سکتی ہے۔ جتنا امت کی یک جہتی اور اخوت کا تصور مضبوط ہو گا' اتنا ہی عالمی اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار ہو گا۔ یہی آج کے عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ اللہ وہ وقت جلد لائے' جب مسلم عوام کو حقیقی آزادی نصیب ہو اور ان کے فتح اور خوشی کے جشن عارضی نہ ہوں۔

عالم نسواں

خواتین ہسپتال' خواتین کی نگرانی میں

فہاد الکیلانی' ترجمہ: محمد احمد زبیری

سرجری کے شعبے میں بہت کم لیڈی ڈاکٹر آگے بڑھتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپریشن کروانے والے بھی' خواتین کے ہاتھ میں نشتر پر اعتماد نہیں کرتے۔ مغرب میں تو زچگی کے کیس بھی مرد ڈاکٹر کرتے ہیں اور کوئی روایات کی پاسدار مسلمان خاتون' مرد ڈاکٹر سے نہ کروانا چاہے' تو لیڈی ڈاکٹر کے لیے پہلے سے بتا کر خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ مسلمان معاشروں کی تو یہ ضرورت ہے کہ خواتین کو ہر طرح کی سہولت خواتین ہی کے ذریعے فراہم ہو لیکن عموماً خواتین مریض' مرد ڈاکٹروں سے علاج اور آپریشن وغیرہ کروانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اگر ماہر خواتین ڈاکٹر آگے آئیں تو خواتین اپنے علاج کے لیے خواتین پر انحصار کر سکیں گی۔ برادر مسلم ملک مصر کے شہر قاہرہ میں ایک لیڈی سرجن' سحر الفقی نے اپنا ہسپتال قائم کیا ہے جسے خواتین ہی چلا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سحر الفقی جامعہ ازہر میں اسسٹنٹ سرجن ہیں۔ اس کے علاوہ قاہرہ کے علاقے "زیتون" میں ایک اسلامی ہسپتال کی بانی ہیں۔ یہ مصر کا پہلا ہسپتال ہے جس کا تمام تر عملہ خواتین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سحر الفقی چار بچوں کی ماں ہیں۔ وہ ڈاکٹر' بیوی اور ماں کی حیثیت سے اپنی تمام ذمہ داریاں بطریق احسن انجام دے رہی ہیں۔ ان سے ایک انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے (المجتمع' ۱۹ مئی ۹۸)۔

سوال: سرجری کے میدان میں ہم بہت کم خواتین کو دیکھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے لیے اس مشکل میدان کا انتخاب کیا ہے؟

جواب: بڑی حد تک آپ کی بات درست ہے۔ ابھی تک سرجری کا شعبہ مردوں کا رہین منت ہے۔ مصر میں آپ خواتین سرجن کو انگلیوں پر شمار کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی سب سے اہم وجہ' اس شعبے کے لیے مسلسل محنت' ریاضت اور پڑھائی ہے۔ آئے دن' نئی نئی تحقیقات اور سرجری کے طریقے' ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں اور اس کام کی پیچیدگی اور وسعت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ایک سرجن کو مسلسل محنت کرنا پڑتی ہے اور اسے ایک طویل عرصے کے لیے تعلیم و تعلم سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔ جہاں تک میرا اس شعبے کے انتخاب کا تعلق ہے' تو میرے ذہن میں شروع سے تھا کہ کچھ خواتین ضرور ایسی ہونی چاہییں جو اس میدان میں رہتے ہوئے اپنی بہنوں کی مدد کر سکیں۔ میں نے یہ فرض کفایہ ادا کرنے کے لیے

اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

سوال: اس شعبے میں اپنے آپ کو بحیثیت ڈاکٹر اور سرجن منوانے کے لیے آپ نے کن مشکلات کا سامنا کیا؟
جواب: یقیناً مریضوں سے اپنی حیثیت منوانے کے لیے میں نے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مشکلات پر صبر کرنے کے اجر سے محروم نہیں فرمائے گا۔

سب سے پہلی مشکل مسلسل پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کچھ خواتین سرجن بن جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ یہ ایسی خواتین ہونی چاہییں جو تجربہ کار ہوں اور اپنے شعبے کے اندر مہارت رکھتی ہوں تاکہ وہ معاشرے کو فائدہ پہنچا سکیں' ورنہ صرف سرجن بن جانا کوئی بڑی کامیابی نہیں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میرے اساتذہ میرے تحقیقی پرچوں (research papers) کا مطالعہ بڑی باریک بینی کے ساتھ کرتے اور بڑی مشکل سے نمبر دیتے۔ کیونکہ اس میدان میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے' اس لیے میں نے ضروری جانا کہ زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کروں۔

سب سے آخری مشکل جس کا میں نے سامنا کیا وہ خواتین کی ہچکچاہٹ اور بے اطمینانی تھی کیونکہ وہ مجھ سے آپریشن کروانے میں خطرہ محسوس کرتی تھیں۔ یہ صورت حال کافی عرصہ برقرار رہی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خواتین' مرد سرجنوں کی نسبت مجھے ترجیح دیتی ہیں اور کسی قسم کی گھبراہٹ اور بے چینی محسوس نہیں کرتیں۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ خواتین' میڈیکل کے شعبے میں' مرد حضرات کی نسبت زیادہ مہارت نہیں رکھتیں' حتیٰ کہ عورتوں کے امراض میں بھی۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے؟
جواب: ہم یہ حقیقت تسلیم کریں یا انکار کریں لیکن یہ فی الواقع بالکل فطری ہے کہ عورت کا گھر سے باہر دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینا اضافی ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ کالج اور یونی ورسٹی کی زندگی کے بعد خواتین کی خانگی ذمہ داریاں اتنی زیادہ اور متنوع ہو جاتی ہیں کہ وہ بمشکل اپنے آپ کو کسی اور ذمہ داری کے لیے تیار کر پاتی ہیں۔ اس لیے تعلیمی میدان میں مرد حضرات ان سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ صلاحیتوں کے اعتبار سے خواتین سے کم تر ہی کیوں نہ ہوں۔

سوال: گھر کی مصروفیات اور ہسپتال کی اہم اور نازک ذمہ داریوں کے درمیان توازن قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آپ اس مشکل اور کٹھن چیلنج کو قبول کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئیں؟
جواب: یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت اور توفیق سے ممکن ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خانگی مصروفیات کے ساتھ ساتھ دیگر ذمہ داریاں نبھانا' ایک کٹھن مرحلہ ہے بالخصوص سرجری کے شعبے میں۔ ایک سمجھ دار شوہر اس شعبہ کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ میرے چار بچے ہیں جو مختلف کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں۔ خانگی مصروفیات میں جو کمی کوتاہی ہو جائے' میرے شوہر اس سے صرف نظر

کرتے ہیں' اور میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں دونوں ذمہ داریوں کو بہ طریق احسن نبھا رہی ہوں۔

سوال: آپ نے سرجری کے میدان میں کیا نمایاں خدمات سرانجام دیں؟

جواب: میں اور میری ایک ساتھی جو خیری ہسپتال میں میرے ساتھ کام کرتی ہیں' اس بارے میں غور و فکر کرتے رہے کہ کس طرح ہم اپنی بہنوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں' اور سرجری کے شعبے میں انھیں زیادہ سے زیادہ سہولت دے سکیں۔ ابتدا میں مرد سرجن کے مقابلے میں خاتون سرجن پر خواتین اعتماد نہ کرتی تھیں۔ یہ ان کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ چنانچہ ابتدا میں ہم نے خواتین کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ شروع شروع میں ہمارے ہاں مریضوں کی بہت تھوڑی تعداد آتی تھی لیکن صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں مریضوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ہم روزانہ آنے والے مریضوں کا ابتدائی معائنہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے اپنے پرائیویٹ کلینک کو چھوڑ دیا اور اپنا سارا وقت ہسپتال کو دے دیا اور خیری ہسپتال کی ایک پوری منزل ہم نے لے لی۔ اس طرح سے ہمیں خواتین کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی جو کہ واقعتاً ایک بڑی کامیابی ہے۔

اس میدان میں ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج خواتین ڈاکٹر' خواتین سرجن اور خواتین انتظامیہ پر مبنی ایک ٹیم کی تیاری تھی۔ ہمارے پیش نظر ایک مکمل خواتین ہسپتال تھا۔ چنانچہ ہم نے مختلف سطح پر رابطے کیے اور بالآخر ایک مربوط و موثر ٹیم بنانے میں کامیابی و سرخروئی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کام کے لیے ہمیں اپنی بہت سی اعلیٰ تعلیم یافتہ' ماہر اور تجربہ کار بہنوں کا تعاون حاصل ہے۔ چونکہ ہم نے یہ ہسپتال صرف خواتین کے لیے قائم کیا ہے' اس لیے آپ اس ہسپتال میں صرف اور صرف خواتین ہی کو دیکھیں گی' خواہ وہ مریض ہوں' ڈاکٹر ہوں' سرجن ہوں یا ہسپتال انتظامیہ ہو مردوں کا داخلہ قطعی ممنوع ہے۔ اس کے علاوہ غریب اور نادار خواتین کے لیے مفت سرجری کی سہولت بھی حاصل ہے۔

سوال: آپ لیڈی ڈاکٹرز اور طالبات کے لیے کیا پیغام دینا پسند کریں گی؟

جواب: جو بہنیں اس میدان میں قدم رکھنا چاہتی ہیں' ان کا اس شعبے سے' ذہنی میلان' گہرا لگاؤ اور تعلق ہونا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیں' تب ہی ان کی صلاحیتیں مکمل طور پر پروان چڑھ سکیں گی۔ سرجری کے میدان میں اپنا نام پیدا کرنا اور دوسروں سے سبقت لے جانا' قربانیوں کا متقاضی ہے۔ میں اپنے رشتے داروں اور گھر والوں سے سال میں صرف ایک یا دو دفعہ مل سکتی ہوں' عیدین کے موقع پر۔ اجتماعی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لے سکتی ہوں۔ یہ اس میدان کی عملی مشکلات ہیں۔

میں میڈیکل کی ہر طالبہ سے امید رکھتی ہوں کہ وہ پچھلی صف پر قانع نہیں رہے گی بلکہ معاشرے کی تعمیر و ترقی اور خواتین کی خدمت میں آگے بڑھ کر عملاً اپنا فرض ادا کرے گی۔

رسائل و مسائل

صنعتی ترقی اور اخلاقی اقدار

سوال: جن ملکوں میں صنعتی ترقی ہوئی وہاں لازمی طور پر عام اخلاقی تنزل ہوا۔ ملوں، کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عورت، مرد، بچے تک مشینوں کے پرزے بن گئے۔ ان ملکوں میں نتیجے کے طور پر کچھ مفکر پیدا ہوئے (مثلاً امریکہ میں جان ڈیوی) جنھوں نے نئی طرز کی زندگی کو نظریاتی سہارا دیا۔ روایات کو غلط قرار دیا اور سوسائٹی کی اقدار ہی کو بدل دیا۔ پاکستان میں ایک طرف تو صنعتی ترقی ضروری ہے مگر دوسری طرف اسلامی روایات اور اقدار کو قائم رکھنا فرض ہے۔ براہ کرم فرمایئے کہ یہ بظاہر متضاد مقاصد کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ مشینی فضا میں روح کیسے تازہ رہ سکتی ہے؟ تبدیلیاں لازمی ہیں مگر کس حد تک قابل قبول ہیں؟

جواب: انسانی تمدن میں مادی تغیرات کی مثال ان تغیرات کی سی ہے جو فرد انسانی کے جسم میں بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی طرف منتقل ہوتے وقت رونما ہوتے ہیں۔ ان کا روح اور نفس سے گہرا تعلق ضرور ہے مگر ان تغیرات کے نتائج کا کوئی ایسا متعین اور قطعی ٹھپہ نہیں ہے جو تمام انسانوں کے نفس پر ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ لگتا ہو۔ بلکہ ان میں فرد فرد کے لحاظ سے بھی اور انسانی جماعتوں کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس میں بہت سے دوسرے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم، تربیت اور معاشرتی ڈھانچہ جو کسی فرد انسانی کو میسر آئے، ایسا صالح ہو کہ فرد کو ارتقائے حیات کی طرف لے جانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ اور مضبوط سیرت کو بھی اس کے اندر نشوونما دیتا رہے، تو بچپن سے جوانی کی عمر میں داخل ہوتے وقت اس کی طبیعت کی جولانی غلط راہوں پر جانے کے بجائے بہترین تعمیری راہیں اختیار کرتی ہے اور یہی ارتقا بڑھاپے تک صحیح طریقے سے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم کسی صحیح فکر کو نشوونما دینے والے فلسفے پر مبنی نہ ہو اور تربیت بھی غلط عادات و خصائل پیدا کرنے والی ہو، اور پھر معاشرتی ڈھانچہ بھی بگاڑنے والا ہی میسر آئے، تو ایک بچہ آغاز ہوش ہی سے مجرم بننا شروع ہوتا ہے۔ جوان ہو کر چور اور ڈاکو بن کر اٹھتا ہے اور بڑھاپے تک اس کی جرائم پیشگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن میں جو مادی تغیر، مثلاً صنعتی انقلاب سے رونما ہوا، اس میں بجائے خود کوئی خرابی

نہ تھی۔ اس میں انسان کی بھلائی ہی کا سامان تھا' جیسے جوانی کا آنا بجائے خود کوئی برائی نہیں بلکہ انسان کے لیے اپنی ذات میں رحمت ہی ہے۔ لیکن قصور اس فلسفۂ حیات کا تھا جو سولھویں سترھویں صدی سے یورپ میں نشوونما پا رہا تھا۔ اس نے ذہن کو بگاڑا' ذہن کے بگاڑ نے اخلاق خراب کیے اور اخلاق کی خرابی نے معاشرتی ڈھانچے کو' جو دور جاگیرداری سے بگڑا ہوا چلا آ رہا تھا اور زیادہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس حالت میں صنعتی انقلاب کی طاقت میسر آ جانے سے قوموں کی قومیں جرائم پیشہ بن گئیں اور اب ایٹم کی طاقت پا کر تہذیب کی ساری نمائشوں کے باوجود اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کی طرف جا رہی ہیں۔ اس حالت میں جو فلاسفر لوگوں کو اس بگاڑ پر مطمئن کرنے کے لیے' نئے نئے نظریاتی سہارے دیتے ہیں اور بگڑے ہوئے سانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے سوسائٹی کی اقدار بدلنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کی مثال اس دشمن دوست نما کی سی ہے جو ایک بگڑتے ہوئے بچے کو پہلی مرتبہ جیب کاٹنے پر شاباش کہے اور اسے یقین دلائے کہ یہ جیب تراشی تو ایک بہترین آرٹ ہے جس کی مذمت کرنے والے لوگ محض دقیانوسی ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مادی ترقی کے مقاصد اور اسلامی اقدار کے مقاصد میں کوئی حقیقی تضاد ہے۔ نہ میں یہ جانتا ہوں کہ یورپ میں صنعتی ترقی کے ساتھ جس مخصوص تمدن و تہذیب نے نشوونما پایا ہے' یہ صنعتی ترقی سے کوئی جوہری تلازم رکھتا ہے اور لازماً جب اور جہاں بھی یہ ترقی ہو گی' وہاں یہی تہذیب ظہور میں آئے گی' یا آنی چاہیے۔ اسی طرح یہ مفروضہ بھی میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ انسانی روح چرخے اور چاک اور چکی کے ساتھ تو تازہ دم رہ سکتی تھی مگر مشین ہی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اس سے سابقہ پیش آتے ہی اس روح پر مردنی چھا جائے۔ میرے نزدیک' ایک صحیح فلسفۂ حیات سے اگر ذہن درست کیے جائیں' ایک صالح نظام اخلاق اگر سیرت گری کے لیے استعمال کیا جائے' اور ایک معتدل و متوازن معاشرتی ڈھانچہ انسانوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہو تو صنعتی ارتقا اور سائنس سے حاصل ہونے والی قوتوں کا استعمال' موجودہ مغربی تمدن و تہذیب سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ایک دوسرے تمدن و تہذیب کو نشوونما دے سکتا ہے' جو اس سے بدرجہا زیادہ طاقت ور بھی ہو اور پھر انسانیت کے لیے باعث رحمت بھی۔

مجھے یقین ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہمیں اس طرح کا فلسفہ حیات اور نظام اخلاق دے سکتا ہے۔ اس کی رہنمائی عملاً قبول کر کے اگر ہم اس کی ہدایات کے مطابق اپنا نظام تعلیم و تربیت عامہ اور اپنا معاشرتی ڈھانچہ بنا لیں' تو ان شرائط کی تکمیل ہو سکتی ہے جو اوپر میں نے مادی ترقی کے ساتھ ایک صالح تہذیب کی تشکیل کے لیے بیان کی ہیں۔ اس معاملے میں یہودیت پہلے ہی مایوس کن تھی۔ عیسائیت نئے دور کے آغاز ہی میں ناکام ثابت ہو گئی اور بودھ مت سرے سے اس میدان کا مرد تھا ہی نہیں۔ رہے جدید مذاہب' سوشلزم' فاشزم اور کیپٹلزم' سو وہ اپنے تمام عیوب و محاسن کھول کر سامنے لا چکے ہیں اور دنیا خوب

دیکھ چکی ہے کہ ان کے محاسن کو ان کے عیوب سے کیا نسبت ہے۔ نیا کوئی فلسفہ بھی اب تک ایسا سامنے نہیں آیا ہے جو ایک تہذیب کی بنیاد بننے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کو سوچنے والے تمام تر اہل مغرب ہیں اور وہ اپنی اس تہذیب کے زہریلے پن سے تنگ آنے کے باوجود اس کی بنیادوں میں تغیر کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ ان کے ذہن اس کے حدود سے آزاد ہو کر سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ صرف جزوی ترمیمات سے کام چلانا چاہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی تجویز کردہ ترمیمیں مزید بگاڑ ہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

اس مختصر خط میں میرے لیے وہ وجوہ بیان کرنا مشکل ہے جن کی بنا پر میں اس معاملے میں اسلام کو علی وجہ البصیرت کافی ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لیے ایک شعاع امید سمجھتا ہوں۔ ان دلائل کے اعادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میں انھیں اپنی متعدد کتابوں میں بیان کر چکا ہوں، مثلاً اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی وغیرہ۔ اس کے علاوہ میرے بہت سے مضامین میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، رسائل و مسائل، حصہ سوم، ص ۴۵-۵۰، اگست ۱۹۹۲۔ اخذ و تدوین م-س)

کتاب نما

اردو ترجمہ قرآن حکیم مرتبہ: سید شبیر احمد۔ ناشر: قرآن آسان تحریک۔ ۱۳؍اے/۲۔ ایجوکیشن ٹاؤن' وحدت روڈ' لاہور-۱۸۔ صفحات: ۱۰۸۰ (بڑی تقطیع)۔ ہدیہ: ۳۰۰ روپے۔

سید شبیر احمد صاحب نے کئی برس پہلے' ترجمہ قرآن پاک کے ایک سلسلے کا آغاز کیا تھا' (دیکھیے: ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۹۳ء)۔ انھوں نے اردو کے چار معروف تراجم قرآن (شاہ رفیع الدین' مولانا محمود حسن' مولانا فتح محمد جالندھری' مولانا مودودی) کو اپنی ترجمے کی بنیاد بنایا اور ان میں سے سادہ' آسان اور عام فہم الفاظ پر مشتمل عبارات کا انتخاب کر کے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے' جس میں الفاظ کی ترتیب وہی ہے' جو قرآن مجید میں عربی الفاظ کی ہے' اس طرح قاری کو بغیر کسی دقت کے' معلوم ہو جاتا ہے کہ عربی کے کس لفظ کے معنی اردو میں کیا ہیں۔

متن اور ترجمے میں' مختلف الفاظ کے معانی کے تعین کے لیے' عربی متن اور اردو ترجمے کو دو مختلف رنگوں یعنی نیلے اور سرخ رنگ میں اس طرح چھاپا گیا ہے کہ عربی متن میں جو لفظ نیلے رنگ میں ہے' اس کا ترجمہ بھی نیلے رنگ میں اور جو لفظ سرخ رنگ میں ہے' اس کا ترجمہ بھی سرخ رنگ میں ہے۔ یوں قاری کے لیے الفاظ کے معنی جان لینا بہت آسان ہو گیا ہے۔ حسب ضرورت قوسین سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سید شبیر احمد صاحب کے جدت پسند ذہن نے ترجمہ قرآن کی ایک حقیقی ضرورت پوری کرنے کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے' وہ اپنی جگہ بہت مفید ہے۔ امید واثق ہے کہ فہم قرآن کے خواہش مند قارئین کے لیے یہ طریقہ بہت سود مند ثابت ہو گا۔

قبل ازیں اس کے مختلف اجزا شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب ترجمہ مکمل ہونے پر اسے ایک جلد میں چھاپا گیا ہے۔ (الگ الگ پاروں کی شکل میں بھی دستیاب ہے)۔ فاضل مترجم نے افراد امت کو بھی دعوت دی ہے کہ وہ "قرآن آسان تحریک" میں شامل ہو کر اس کار خیر میں تعاون کریں۔ طباعت و اشاعت معیاری ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

تعلیم و تدریس' مباحث و مسائل ' ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی۔ ناشر: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن' گرین پلازا' جی ۹ مرکز' اسلام آباد۔ صفحات: ۳۱۸۔ قیمت: مجلد ۲۵۰ روپے۔

قوموں کے عروج و زوال میں تعلیم بنیادی کردار ادا کرتی ہے مگر افسوس ہے کہ وطن عزیز میں یہی شعبہ سب سے زیادہ عدم توجہ کا شکار ہے۔ تعلیم کے اس مظلوم شعبے سے 'اکثریت کی وابستگی' محض ملازمت کے لیے ہے۔ لیکن اگر معلم' اعلیٰ تصور حیات اور آخرت میں جواب دہی کے احساس سے بھی سرشار ہو تو اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو گی۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی' روایتی انداز کے استاد نہیں' بلکہ استاد کے حقیقی مقام و مرتبے کے مصداق ہیں۔ وہ نئے اساتذہ کے مربی ہیں' اسلامی تصور حیات کے سرچشموں سے فیض یاب ہیں اور بذریعہ تحریر و تقریر اظہار و بیان کے بے لاگ انداز سے' فکر و خیال کی دنیا کو معطر کرتے ہیں۔

ایک راست فکر انسان اور فنافی التدریس استاد کے قلم پاروں کا یہ انتخاب پاکستان ہی نہیں' بلکہ کسی بھی مسلم معاشرے کے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل' اساتذہ کی نظریاتی و پیشہ ورانہ تربیت' فکری نمو اور طلبہ کی نفسیات کے فہم کی بند گلی کھولتا ہے۔ اس میں اسلامی فلسفہ تعلیم کو فلسفیانہ منہج اور اطلاقی جہت میں دل نشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

انیس مضامین پر مشتمل اس کتاب کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے شاید یہ ایم اے ایجوکیشن کی کوئی روایتی مددگار کتاب ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب فکر' وژن' راستی' حقیقت پسندی' پیشہ ورانہ دیانت اور تحقیق و تطبیق کی ایک ایسی جامع دستاویز ہے جس میں پورے تعلیمی عمل کو سنوارنے' بنانے اور اعلیٰ معیار تک پہنچانے کی بھرپور اور موثر کاوش موجود ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انگلی پکڑ کر ایک ایک موڑ اور نشیب و فراز سے بہ سلامت گزارنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب سے ہر درجے کے اساتذہ' علما' تعلیمی پالیسی ساز اور اسلامی تحریکوں کے ارباب حل و عقد روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ (سلیم منصور خالد)

پاکستان کا جوہری پروگرام' قومی سلامتی کے تناظر میں' مرتبہ: محمد الیاس خان۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' نصر چیمبر' ایف سیون مرکز' اسلام آباد۔ صفحات: ۲۹۸۔ قیمت: درج نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد ایک آزاد علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جس کے مقاصد میں مختلف شعبوں میں ملکی پالیسیوں اور مسائل سے متعلق ماہرین اور اصحاب بصیرت کے درمیان بحث و مباحثوں' مکالموں اور مذاکروں کا اہتمام شامل ہے۔ ادارہ خود بھی' اپنے محنتی تحقیق کاروں کی ایک جماعت کے ذریعے مسائل پر بے لاگ تجزیہ و تحقیق کر کے نتائج اور رپورٹیں شائع کرتا ہے تاکہ ان کی روشنی میں پالیسی ساز ادارے بہتر فیصلے کر سکیں۔

ادارے نے دسمبر ۱۹۹۳' پھر دسمبر ۱۹۹۴ میں پاکستان کے جوہری پروگرام اور اس سے متعلقہ مسائل پر دو سی نار منعقد کیے' جن میں ماہرین سفارت کاری و دفاعی امور اور سیاسی حکمت عملیوں کا وسیع تجربہ رکھنے والے اصحاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا (مثلاً: جناب آغا شاہی' جنرل (ر) کے ایم عارف' جناب عبدالستار' ڈاکٹر ایس ایم قریشی' لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی' ایئر مارشل (ر) ذوالفقار علی خان' ڈاکٹر شیریں مزاری اور سیدہ عابدہ حسین)۔ ادارے کے سربراہ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں: "دفاعی اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور قوم کے جذبہ حب الوطنی کے بعد جو چیز ہمارے ملک و قوم کے تحفظ کی ضامن ہے' وہ سد جارحیت کی جوہری اہلیت (nuclear deterrence) اور میزائل سازی کی صلاحیت ہے"۔ متذکرہ بالا مذاکروں کے مقررین اور مقالہ نگار (بعض جزئیات پر اختلاف سے قطع نظر) متفق ہیں کہ پاکستان کو سد جارحیت کی جوہری صلاحیت کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ ہماری آزادی اور بقا کا مسئلہ ہے۔

یہ مقالے اور تقریریں فکر انگیز اور معلومات افزا حقائق و دلائل پر مبنی ہیں۔ ان سے پاکستان کے بارے میں بڑی طاقتوں کا معاندانہ رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ سیدہ عابدہ حسین کو بطور سفیر امریکہ میں قیام کے زمانے میں امریکیوں کے ایسے رویے کا تجربہ ہوا جو بے انصافی پر مبنی اور بے حد کوفت میں مبتلا کرنے والا تھا۔ ایک ملاقات میں امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے کشمیر میں پاکستان کی "دہشت گردی" کا ذکر کیا تو سفیر صاحبہ نے کہا کہ وہ تو متنازع علاقہ ہے اور مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی اس کے علاقے پر ناجائز قبضہ کرے تو قابض کے خلاف علم جہاد بلند کیا جائے۔ افغانستان کے بعد اب کشمیر میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ افغانستان میں تو امریکیوں نے مجاہدین کی پشت پناہی کی اور اسلحہ دے کر عملی مدد کی' اب کشمیر میں ویسا ہی جہاد' "دہشت گردی" کیوں ہو گیا ــــــ؟

آج جب کہ پاکستان ایٹمی دھماکا کر چکا ہے' اندازہ ہوتا ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے یہ مذاکرے کس قدر اہم اور بروقت تھے۔ ان مذاکروں سے مسئلہ صحیح تناظر میں سامنے آیا' ادارہ سی ناروں کے انعقاد اور زیر نظر کتاب کی اشاعت پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ آج کل کے حالات میں کتاب خصوصاً لائق مطالعہ ہے۔

جناب محمد الیاس خاں نے ایک لائق اسکالر کی طرح' بڑی محنت و کاوش سے انگریزی مقالوں اور تقریروں کو اردو میں منتقل کیا۔ پھر اس مسئلے پر' بعدازاں رونما ہونے والی پیش رفت اور تازہ معلومات کو بھی کتاب میں سمو دیا۔ انگریزی الفاظ و تراکیب کے تراجم میں بھی انھوں نے خاصی محنت کی ہے۔ آخر میں "انگریزی کی متبادل اردو اصطلاحات" کی فہرست بھی دی ہے مگر بعض جگہ ان سے اتفاق مشکل ہے۔

Technology کے لیے "تقنیہ" تکلف محض ہے۔ freezing کے لیے تجمید کے بجائے منجمد کرنا بہتر ہے۔ بعض آسان الفاظ و تراکیب کے انگریزی متبادل دینا ضروری نہ تھا، جیسے تعارف (introduction) یا ناقابل قبول (unacceptable) وغیرہ۔ سرورق پر "تصنیف و تالیف" کے بجائے "ترجمہ و تدوین" زیادہ مناسب تھا۔ (ر - ہ)

اقبال : چند نئے مباحث، ڈاکٹر تحسین فراقی۔ ناشر: اقبال اکادمی، ایوان اقبال، لاہور۔ صفحات: ۲۰۷۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

چھ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ معروف نقاد، ادیب اور شاعر ڈاکٹر تحسین فراقی کے انتقاد و تحقیق اور اقبال شناسی کا تازہ نمونہ ہے۔ بلاشبہ: "اقبال کی شاعری اپنے فن اور اسلوب کے اعتبار سے اتنی منفرد ہے کہ قاری اس پر جتنا غور کرتا ہے، اتنے ہی اس کے پہلو دار اور تہ دار ہونے کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے"۔ زیر نظر مضامین میں اسی احساس کی ایک جھلک ملتی ہے۔ شعر اقبال کا مختصر فنی جائزہ، اقبال کے ہاں تہذیب مغرب کا عکس، اور مسلم ثقافت کے خدوخال اور پھر یہ کہ اقبال پارلیمان کو کس حد تک اجتہاد کا اختیار دیتے ہیں؟ زیر نظر مضامین کے اہم مباحث میں بلاشبہ اقبال نے ایک زمانے میں پارلیمان کو حق اجتہاد عطا کرنے کا ذکر کیا تھا لیکن بقول مصنف، اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو ہماری قانون ساز اسمبلیوں کی افسوس ناک کارکردگی کو دیکھ کر، اپنی تجویز یا تو واپس لے لیتے یا کم از کم موخر کر دیتے کیونکہ ان اسمبلیوں میں خاصی بڑی تعداد ایسے ارکان کی ہے جو قرآن ناظرہ نہیں پڑھ سکتے۔ بعض محض "انگوٹھا چھاپ" ہیں اور جاہ طلبی، خود غرضی، ان کی رگ و پے میں ہے (ص ۵۹)۔ ایک مضمون میں مصنف نے کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، مطبوعہ بھارت) کا بڑی دقت نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ جائزہ سبق آموز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ یہ مضمون مصنف کی تحقیقی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ امید ہے کہ ذخیرۂ اقبالیات میں اس کتاب کو بجا طور پر ایک اعتبار حاصل ہو گا۔ (ر - ہ)

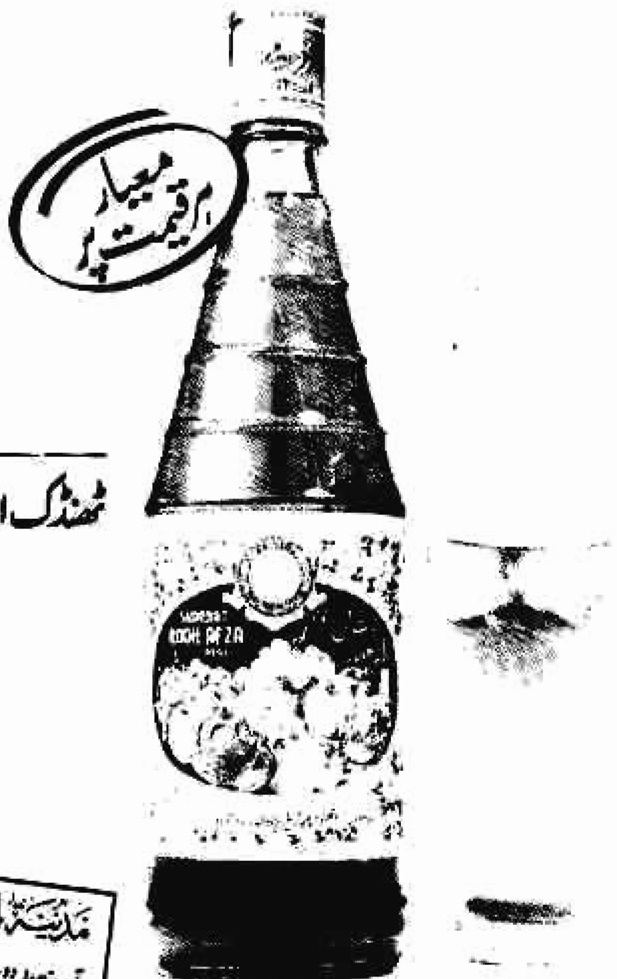
حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
[illegible]

Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.